علم الاخلاق جلد اوّل

(قرآن کی روشنی میں)

مؤلف

آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

ترجمہ

ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی (پی ایچ۔ڈی)

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔علم الاخلاق (قرآن کی روشنی میں)

جلد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اوّل

مؤلف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی (پی ایچ۔ڈی)

کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فضل عباس سیال (الحمد گرافکس لاہور)

سیٹنگ و گرافکس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قلب علی سیال (فون: 0301-7229417)

اشاعت اوّل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔2004ء

اشاعت دوم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔2013ء

ناشر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس کتاب کی اشاعت کیلئے الحاج شیخ وحید احمد نے تعاون فرمایا ہے ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم ان کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے اور ان کے مرحومین کی مغفرت فرمائے۔آمین۔ادارہ۔

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

www.misbahulqurantrust.com

انتساب

قرآن کے حقیقی وارث

اور

قرآنی نظام کو پوری دنیا میں نافذ کرنے والی ذاتِ گرامی

حضرت امامِ زمانہ علیہ السلام (عجل اللہ تعالیٰ فرجہٗ شریف)

کے نام

فہرست مضامین

عرض مترجم 10
عرض ناشر 13
تمہید 14
پہلا باب: اخلاقی مباحث کی اہمیت 16
اسلامی روایات میں اخلاق کی اہمیت 20
۱۔علم اخلاق کی تعریف 22
۲۔فلسفہ اور اخلاق کا تعلق 23
۳۔اخلاق اور عرفان کا تعلق 24
۴۔اخلاق اور علم کا تعلق 25
۵۔آیا اخلاق میں تبدیلی ممکن ہے؟ 27
اخلاقی تبدیلی کے امکان پر آیات وروایات 31
اخلاق میں عدم تغیر کے قائلین کے دلائل 34
۶۔علم اخلاق کی مختصر تاریخ 35
۱۔سلمان فارسیؓ 37
۲۔ابوذر غفاریؓ 37
۳۔عمار یاسرؓ 37
۴۔نوف بکالی 38
۵۔محمد بن ابوبکر 38
۶۔جارود ابن منذر 38
۷۔حذیفہ بن منصور 38
۸۔عثمان بن سعید عمری 38
دوسرا باب انسانی زندگی اور تمدن میں اخلاق کا کردار 40

احادیث کی روشنی میں مادی زندگی اور اخلاق کا باہمی تعلق 51
تیسرا باب: اخلاقی مکاتب فکر 54
۱۔ اخلاق اور مکتب توحید 55
۲۔ اخلاق اور مادیت 55
۳۔ اخلاق اور عقلی فلسفہ 56
۴۔ اخلاق اور دیگر پسندی 56
۵۔ اخلاق اور ضمیر پرستی 56
۱۔ اخلاق اور نسبیت (Relativity) 57
۲۔ اخلاق اور رویے کا متقابل اثر 62
اخلاق اور عمل کا متقابل اثر احادیث کی روشنی میں 64
۳۔ انفرادی اور اجتماعی اخلاق 66
چوتھا باب: اخلاقی بنیادیں 68
۱۔ منفعت طلبی کی بنیاد 68
۲۔ عقلی بنیاد 69
۳۔ شخصیت کی بنیاد 70
۴۔ الٰہی بنیاد 71
اہم نکتہ 76
پانچواں باب: اخلاق اور آزادی 77
عقیدۂ جبر اور غیر اخلاقی مسائل 80
چھٹا باب: قرآن مجید میں اخلاق کے بنیادی اصول 83
تنقید و تحقیق 84
قرآن کے اخلاقی اصول 86
اصولِ اخلاق اسلامی اور احادیث 89
ساتواں باب: اخلاقی مسائل کا ایک دوسرے سے تعلق 98

آٹھواں باب: کہاں سے شروع کریں؟ 101
اخلاقی مسائل کا سامنا کرنے کے بارے میں تین نظریات 101
دوسرا نظریہ: روحانی طب 103
تیسرا نظریہ: سیر وسلوک 107
نواں باب: سیر وسلوک کے مختلف طریقے 111
ا۔ سیر وسلوک بحر العلوم 111
اس روش کے مطابق سیر وسلوک کی کیفیت 112
۲۔ مرحوم ملکی تبریزی کا طریقہ 115
ایک اور طریقہ 116
مکاتب سیر وسلوک کا خلاصہ اور نتیجہ 118
دسواں باب: کیا ہر مرحلہ پر استاد اور رہنما کی ضرورت ہوتی ہے؟ 120
واعظ درونی کا کردار 122
گیارھواں باب: اخلاقی فضائل کی پرورش کے لیے ضروری تیاری 124
ا۔ ماحول کی پاکیزگی 124
تفسیر ونتیجہ 125
۲۔ صحبت کا اثر 128
تفسیر اور نتیجہ 130
دوستوں کا کردار احادیث کی روشنی میں 133
صحبت کا اثر منطق کی روشنی میں 135
۳۔ اخلاق پر خاندانی تربیت وو راثت کا اثر 137
تفسیر ونتیجہ 139
اخلاق اور خاندانی تربیت احادیث کی روشنی میں 142
۴۔ علم وآگہی کا اثر 146
علم اور اخلاق کا تعلق احادیث کی روشنی میں 150

۵۔معاشرتی ثقافت کا اخلاقی تربیت پر اثر 154
تفسیر اور نتیجہ 156
معاشرتی آداب ورسوم اور اخلاق کا باہمی تعلق احادیث کی روشنی میں 160
۶۔عمل اور اخلاق کا تعلق 163
تفسیر اور ترجمہ 164
اخلاق پر اعمال کا اثر احادیث کی روشنی میں 172
اخلاق اور خوراک کا باہمی تعلق 175
خوراک اور اخلاق کا تعلق احادیث کی روشنی میں 177
اخلاقی صفات اور اخلاقی اعمال 182
بارھواں باب: تہذیب اخلاق کی طرف عملی قدم 183
پہلا قدم توبہ 183
۱۔حقیقت توبہ 185
۲۔وجوب توبہ 185
۳۔توبہ کی عمومیت 187
۴۔ارکانِ توبہ 192
۵۔قبولیت توبہ عقلی ہے یا نقلی 198
۶۔جزئی توبہ 200
۷۔توبہ کی پائیداری 201
۸۔توبہ کے درجات 203
۹۔توبہ کے اثرات وبرکات 205
دوسرا قدم۔مشارطہ 208
تیسرا قدم مراقبہ 210
چوتھا قدم محاسبہ 214
پانچواں قدم معاتبہ ومعاقبہ (سرزنش اور سزا) 221

نیت اور اخلاصِ نیت 226
نیت کے ایک اور معنی 227
اخلاص 229
اخلاص احادیث کی روشنی میں 232
اخلاص کی حقیقت 234
اخلاص کی راہ میں رکاوٹیں 236
اخلاص کے آثار 238
ریاکاری 239
تفسیر 240
ریا احادیث کی روشنی میں 244
ریا کی حرمت کا فلسفہ 247
ریا کاروں کی علامات 247
ریا کا علاج 249
کیا عبادت میں نشاط خلافِ اخلاص ہے؟ 251
ریا اور سمعہ کا فرق 252
خاموشی اور اصلاحِ زبان 253
خاموشی، احادیث کی روشنی میں 256
ایک غلط فہمی کا ازالہ 258
اصلاحِ زبان 260
۱۔اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت 261
۲۔زبان کا فکر و اخلاق سے تعلق 265
۳۔آفات اللسان یا زبان کے خطرات 268
۴۔خطراتِ زبان سے بچنے کے کلی اصول 270
۱۔خطرات زبان کی طرف سنجیدہ توجہ 270

۲۔خاموشی 271
۳۔حفاظت زبان (بولنے سے پہلے سوچنا) 272
خودشناسی اور خداشناسی 273
۱۔خودشناسی اور تہذیب نفس کا باہمی تعلق 274
۲۔خودشناسی احادیث کی روشنی میں 275
۳۔خودشناسی خداشناسی کا ذریعہ ہے 277
حدیث ''من عرف نفسہ'' کی سات تفسیریں 278
خودشناسی کی رکاوٹیں 281
عبادت اور دعا روح کو پروان چڑھاتی ہیں 283
تفسیر اور نتیجہ 285
پاکیزگی روح میں عبادات کا کردار احادیث کی روشنی میں 290
اللہ کا ذکر اور پرورش روح 293
تفسیر و نتیجہ 295
ذکر اور تہذیب نفس کا باہمی تعلق احادیث کی روشنی میں 301
۱۔حقیقت ذکر 303
۲۔درجاتِ ذکر 305
ذکر کی رکاوٹیں 306
تیرھواں باب: نمونہ ہائے عمل 309
تفسیر اور نتیجہ 311
تولیٰ و تبریٰ احادیث کی روشنی میں 317
داستانِ موسیٰ و خضر 324
چودھواں باب: ولایت کا ایک اور چہرہ اور تہذیب نفوس میں اس کا کردار 327
علامہ مطہری شہید کا نظریہ 332
ناجائز مفاد پرستی 334

عرض مترجم

جب سے اس کرۂ خاکی پر انسانی معاشرہ معرضِ وجود میں آیا ہے، اخلاقی فضائل کی ضرورت اور اہمیت ہر دور اور ہر معاشرے میں تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور اور ہر معاشرے میں اخلاقی فضائل سے آراستہ انسانوں کو عزت اور تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا رہا اور اخلاقی فضائل سے محروم افراد ہمیشہ ناپسندیدہ اور قابل مذمت ٹھہرائے جاتے رہے۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اخلاقی فضائل کی کشش انسان کی فطرت اور اس کی سرشت میں رکھ دی ہے۔ دنیا کا ہر انسان خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب، رنگ، نسل یا خطے سے ہو، عدل، سچائی، ایمانداری، عفت، شجاعت اور علم سے محبت کرتا ہے اور انہیں پسندیدہ انسانی صفات مانتا ہے۔ اسی طرح وہ ظلم، جھوٹ، خیانت، بزدلی اور جہل کو ناپسندیدہ اخلاقی صفات قرار دے کر ان سے نفرت کرتا ہے۔ جو افراد اخلاقی فضائل سے محروم ہیں، وہ بھی کوشش کرتے ہیں کہ بظاہر ایسا رویہ اختیار کریں کہ لوگ انہیں فضائل اخلاقی سے آراستہ سمجھیں۔

آپ کو دنیا میں ایسا کوئی جاہل نہیں ملے گا جو جہل کو پسند کرتا ہو۔ آپ کو دنیا میں کوئی ایسا فریب کار اور خائن نہیں ملے گا جو اپنے آپ کو ایماندار ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرتا ہو۔ دنیا کے ظالم ترین اور جابر ترین حکمران بھی عدل و انصاف کے قیام کے دعوے کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ سب باتیں اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں کہ حسن و قبح اخلاقی اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ضمیر کے اندر ودیعت کر دیا ہے۔

جس معاشرے میں اخلاقی فضائل زندہ اور معاشرتی زندگی پر حاکم ہوں، اس معاشرے میں نہ صرف یہ کہ زندگی آرام و سکون سے گزرتی ہے بلکہ اس معاشرے میں انسان کو روحانی ترقی کے بھی زیادہ مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جس معاشرے میں اخلاقی فضائل صرف کتب اور علماء و واعظین کی تقریروں تک محدود ہوں اور عملی زندگی میں ان کی کوئی جھلک نظر نہ آئے، اس معاشرے میں نہ صرف یہ کہ زندگی عذاب بن جاتی ہے بلکہ انسان کی معنوی ترقی کی راہیں بھی مسدود ہو جاتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں انسانیت کا درد رکھنے والے مفکرین اور مصلحین نے معاشرے میں اخلاقی فضائل کی بالادستی قائم کرنے کے لیے علمی، فکری اور عملی جدوجہد کی۔ اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی انبیاء بھیجے، ان سب کی بعثت کا مقصد بھی اخلاقی فضائل کی بالادستی قائم کرنا تھا۔ رسول اللہؐ کی مشہور و معروف حدیث ہے:

"انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق"

''میں اچھے اخلاق کی تکمیل کیلئے بھیجا گیا ہوں۔''

یہ حدیث نبویؐ بہت گہرے معنی پر مشتمل ہے مگر اس کی گہرائی پر عام طور پر نظر نہیں کی جاتی۔ غور فرمائیں کہ حضورؐ نے یہ نہیں

فرمایا کہ میں تمہیں عقائد واعمال کی تعلیم دینے آیا ہوں یا بالفاظ دیگر آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں تمہیں اصولِ دین اور فروع دین کی تعلیم دینے آیا ہوں بلکہ آپؐ نے "انما" کا لفظ استعمال کر کے یہ بیان فرمایا کہ میری بعثت کا مقصد اچھے اخلاق کی تکمیل کے سوا کچھ نہیں۔ اس سے ہم بخوبی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ عقائد واعمالِ اسلامی یا اصولِ دین وفروع دین کا مقصد ہمارے اندر اچھے اخلاق کو پروان چڑھانا ہے۔

اس بات کی تائید اس حدیث سے بھی ہو جاتی ہے جو شیعہ وسنی دونوں کی کتب حدیث میں موجود ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

"ما آمن بی من بات جارہ جائعا"

''جو شخص پیٹ بھر کر سو جائے اور اس کا پڑوسی رات کو بھوکا رہے، وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا۔''

اس حدیث میں پڑوسی کے مسلمان ہونے کی شرط نہیں رکھی گئی ہے اور پھر بہت سی احادیث میں ہے کہ پڑوس کی حد چاروں طرف سے چالیس گھر تک ہے۔

نتیجہ یہ کہ اگر آپ نے رات کو سیر ہو کر کھانا کھا لیا اور چاروں طرف چالیس گھروں تک آپ کا کوئی مسلم یا غیر مسلم پڑوسی رات بھر بھوکا سو رہا تو رسولؐ اللہ کی نظر میں آپ مسلمان نہیں، خواہ آپ رات بھر نوافل پڑھتے رہیں اور دن بھر روزہ رکھیں۔

مذہب، رنگ ونسل کے امتیاز سے بالاتر ہو کر ایک اچھا انسان ہونا، اچھا مسلمان ہونے کی بنیادی شرط ہے۔ اگر کوئی شخص بہت بڑا شیخ القرآن والحدیث یا مفتی اعظم بن جائے، علامہ، حجۃ الاسلام، آیت اللہ یا آیت اللہ العظمیٰ بن جائے لیکن اگر وہ اچھا انسان نہیں ہے تو سب بیکار ہے۔

مگر اسے انسان کی بدقسمتی کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے کہ فطری اور عقلی طور پر اخلاقی فضائل کا اعتراف کرنے اور انبیاء و مصلحین کی عالمگیر اصلاحِ اخلاق کی کوششوں کے باوجود، اخلاقی بحران ہر دور میں انسانی معاشرے کا بڑا بحران رہا ہے۔

دورِ حاضر میں یہ بحران انتہائی پیچیدہ اور خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے۔ جب اخلاقی اقدار کی حاکمیت کی جگہ طاقت کی حاکمیت لے لے تو ایسی صورت میں طاقت ہی طاقت کا راستہ روک سکتی ہے۔ اگر طاقت کا توازن بگڑ جائے اور آج کی طرح دنیا ایک بڑی طاقت کے زیر اثر آ جائے تو طاقت کے اندھے استعمال کے نتیجہ میں صرف کمزور انسان ہی نہیں بلکہ اخلاقی اقدار کا جنازہ بھی نکل جاتا ہے۔

اخلاقی بحران کے اس سیلاب کے سامنے بند باندھنے کی جتنی شدید ضرورت آج ہے، شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ قرآن مجید اور معصومین علیہم السلام کی اخلاقی تعلیمات کے بغیر اس بند کی تعمیر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی سرپرستی میں حوزہ علمیہ قم کے چند سینئر طلباء نے ''اخلاق در قرآن'' کے نام سے تین جلدوں پر مشتمل کتاب کی تالیف کا قابل تعریف کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس کتاب میں کتب اخلاق کی عام روش سے ہٹ کر ایک اچھوتا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ جن اخلاقی فضائل ورذائل کا اس کتاب میں ذکر کیا گیا ہے، ان کے بارے میں پہلے قرآنی آیات کی روشنی میں کافی

تفصیل سے بحث کی گئی ہے، بعدازاں اس کے بارے میں احادیث معصومینؑ کی روشنی میں تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔اس کے بعد انسان کی انفرادی اور معاشرتی زندگی پر ان کے اثرات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

جن اخلاقی رذائل کا اس کتاب میں ذکر کیا گیا ہے، ان کے علاج کے طریقے بھی بیان کیے گئے ہیں۔اس کتاب کو بلا مبالغہ ''روحانی اور اخلاقی صحت کا انسائیکلوپیڈیا'' کہا جا سکتا ہے۔اس کتاب کی پہلی جلد ''علم الاخلاق، قرآن کی روشنی میں'' کے نام سے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ادارہ مصباح القرآن نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کروا کر انتہائی مستحسن قدم اٹھایا ہے۔ادارے کو اس اقدام پر مبارک باد نہ دینا بے انصافی ہوگی۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ادارہ مصباح القرآن کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے، اس ادارے کے منتظمین کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور تمام اہل اسلام کو اس کتاب سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے، آمین

خادمِ علوم قرآن واہل بیتؑ

ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی (Ph.D)

10 رنومبر 2004، لاہور۔

عرضِ ناشر

محترم قارئین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشرواشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ادارہ مصباح القرآن ٹرسٹ، آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی زیرسرپرستی لکھی جانے والی کتاب ''اخلاق درقرآن'' کا ترجمہ ''علم الاخلاق (قرآن کی روشنی میں)'' کے نام سے اُردو زبان میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہے۔اس کتاب کی پہلی جلد اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔بلاشبہ یہ کتاب انسان کی زندگی میں انتہائی مثبت تبدیلی لانے کا ذریعہ ثابت ہوسکتی ہے۔آج کل دُنیا اخلاقی حوالہ سے جس جگہ پہنچ چکی ہے، اُس میں اخلاقیات کی خرابی ہی سب سے بڑی وجہ ہے۔لہٰذا اس قسم کی کتابوں کی کثرت سے اشاعت لازمی طور پر معاشرہ میں مثبت تبدیلی لاسکتی ہے۔

مزید برآں آپ ہماری کتب مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ۔۔۔۔۔

www.misbahulqurantrust.com کے ذریعے گھر بیٹھے پڑھ سکتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہرنایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادفرمائیں گے۔اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

تمہید

اخلاقی مسائل کو ہر دور میں غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے لیکن ہمارے دور میں اسے خصوصی اہمیت حاصل ہے جس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ہمارے دور میں اخلاقی بگاڑ اور سیدھی راہ سے انحراف کے اسباب وعوامل ہر زمانہ سے زیادہ ہیں۔ اگر ماضی میں بہت سے برے کاموں کو انجام دینے کیلئے اخراجات اور زحمت برداشت کرنے کی ضرورت تھی تو ہمارے دور میں انسانی ایجادات کی کثرت سے ہر چیز ہر جگہ اور ہر کسی کیلئے دستیاب ہے۔

۲۔ ہمارا دور پیمانوں کے بڑے ہو جانے کا دور ہے۔ جو کام ماضی میں محدود پیمانہ پر ہوتے تھے، وہ اب لامحدود پیمانے پر ہونے لگے ہیں۔

وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی ایجاد کے بعد انسانی قتل وغارت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ سٹیلائٹ کے ذریعے گندی فلمیں ساری دنیا میں پھیلائی جارہی ہیں اور اب انٹرنیٹ کے ذریعے سے ہر قسم کی مضر معلومات دنیا بھر کے لوگوں تک پہنچائی جارہی ہیں جس کی وجہ سے اخلاقی برائیاں بہت وسیع سطح پر پھیل چکی ہیں اور تمام سرحدوں کو توڑتی ہوئی دنیا کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکی ہیں۔ اخلاقی بگاڑ اس قدر پھیل چکا ہے کہ خود اخلاقی بگاڑ کی بنیادی رکھنے والے چیخ اٹھے ہیں۔ اگر ماضی میں منشیات کی پیداوار صرف ایک جگہ، ایک گاؤں یا زیادہ سے زیادہ ایک شہر کو متاثر کرتی تھیں تو اب سمگلروں کے ذریعے ساری دنیا میں پھیلائی جارہی ہیں۔

۳۔ جس طرح طب اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں مفید اور تعمیری معلومات غیر معمولی طور پر دنیا میں پھیلی ہیں، اسی طرح شیطانی علوم اور غیر انسانی اور غیر اخلاقی مقاصد کے حصول کی راہیں ماضی کی نسبت بہت زیادہ وسیع وعریض ہو چکی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جن لوگوں میں برائی کا رجحان پایا جاتا ہے، ان کیلئے ممکن ہو گیا ہے کہ کبھی پیچیدہ اور پراسرار طریقوں اور کبھی سادہ اور آسان ذرائع سے اپنے مقصد تک پہنچ جائیں۔

ایسے حالات میں اخلاقی مسائل اور علم اخلاق کی طرف توجہ کرنا ماضی کے ہر دور کی نسبت زیادہ ضروری ہو گیا ہے، اس سلسلہ میں کسی قسم کی کوتاہی سے ہم بڑے المیے یا المیوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔ انسانیت کا درد رکھنے والے دانشوروں اور آگاہ علماء کا فرض ہے کہ اخلاقی تعمیر نو کیلئے ایک دوسرے سے تعاون کریں اور موجودہ دور میں جبکہ اخلاقیات کو شدید خطرہ لاحق ہے، یہاں تک کہ بعض لوگ اخلاق کا سرے سے انکار کر رہے ہیں یا اسے غیر ضروری سمجھنے لگے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے مقصد کے حصول کیلئے ہر کام کرنے کو اخلاقیات کے عین مطابق قرار دیتے ہیں، ایسے حالات میں علماء اور مفکرین کا فرض ہے کہ اپنی تمام کوشش اور جدوجہد کو بروئے کار لائیں۔

خوش قسمتی سے ہم مسلمانوں کے پاس قرآن مجید جیسا عظیم سرچشمہ موجود ہے جو گہرے اخلاقی مباحث سے اس قدر سرشار ہے کہ دنیا کے کسی دین کی کتب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اگرچہ مفسرین نے قرآن مجید کے اخلاقی مباحث کی تفسیر کی ہے لیکن جہاں تک ہم جانتے ہیں، ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی جو'' '' کے عنوان سے تفسیر موضوعی کے انداز میں ان مسائل کو یکجا کر کے بیان کرتی ہو۔ حالانکہ ایسی کتاب کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔

لہٰذا ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ پیامِ قرآن کے پہلے مجموعہ کے بعد، جس میں ہم نے اسلامی عقائد و معارف کو تفسیر موضوعی کے انداز میں زیر بحث قرار دیا، پیام قرآن کا ایک اور مجموعہ ترتیب دیا جائے جس میں قرآن مجید کے اخلاقی مباحث کو بیان کیا جائے۔

الحمدللہ! یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا اور یہ کتاب دو جلدوں میں تیار ہوئی، پہلی جلد میں اخلاقی مسائل کے کلیات کو زیر بحث لایا گیا ہے جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب سے ایک جامع درسی کتاب کی حیثیت سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری جلد میں اخلاقی مسائل کے جزئیات اور مصادیق پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے، اس کا بہت سا حصہ بھی الحمدللہ اشاعت کیلئے تیار ہو چکا ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی روشنی میں انسانوں کی زندگی کی مشکلات دور کرنے کیلئے یہ دوسرا قدم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہو اور ہمارے لیے روزِ آخرت کا ذخیرہ ہو۔ اگر اس میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو اہل فکر و نظر کی نشاندہی پر اس کی تکمیل کر دی جائے گی۔

والحمدللہ رب العالمین

ربیع الاول ۱۴۱۹

جون/ ۱۹۹۸ء

پہلا باب

اخلاقی مباحث کی اہمیت

اشارہ

قرآنی مباحث میں یہ بحث سب سے اہم ہے اور ایک لحاظ سے یہی انبیائے کرام کی بعثت کا سب سے اہم مقصد تھا، اس لیے کہ اخلاق کے بغیر نہ تو لوگوں کیلئے دین کا کوئی مفہوم باقی رہ جاتا ہے اور نہ ہی ان کے دنیوی امور کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ بقول شاعر ؎

اقوام روزگار بہ اخلاق زندہ اند
قومی کہ گشت فاقد اخلاق مردنی است

(دنیا کی اقوام اخلاق کی بدولت زندہ ہیں۔ اخلاق سے عاری قوم کا مقدر صرف موت ہے)

درحقیقت انسان صرف اسی صورت میں انسان کہلانے کا حقدار ہے جب وہ انسانی اخلاق سے آراستہ ہو، ورنہ وہ ایک ایسا خطرناک حیوان ہے جو انسانی ذہانت سے مسلح ہونے کی وجہ سے ہر چیز کو تباہ کر دیتا ہے، ہر طرف آگ لگا دیتا ہے، اپنے ناجائز مقاصد کے حصول کیلئے جنگ برپا کرتا ہے اور اسلحہ بیچنے کیلئے قوموں کے درمیان نفاق اور تفرقہ کے بیج بو دیتا ہے اور بے گناہوں کو خاک وخون میں غلطاں کر دیتا ہے۔

ممکن ہے ایسا انسان بظاہر متمدن ہو لیکن اس کے باوجود وہ ایک خوش خوراک جانور ہے جو حلال وحرام کے فرق کو پہچانتا ہے نہ ظلم اور عدل کے فرق کو دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی ظالم اور مظلوم کے درمیان امتیاز کرتا ہے۔

اس اشارہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور حقیقت کا بیان قرآن کی زبان سے سنتے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیات پر غور فرمائیے:

۱۔ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۙ﴿۲﴾

''اللہ وہ ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے، انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔'' (جمعہ ۲)

۲۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

''اللہ نے مومنین پر احسان کیا (اورانہیں ایک بڑی نعمت عطا فرمائی) جب ان میں انہی کی قوم سے ایک رسول مبعوث کیا تا کہ وہ انہیں اس کی آیات سنائے، انہیں پاک کرے اورانہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے، اگر چہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔'' (آل عمران: ۱۶۴)

۳۔ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

''(اس طرح ہم نے تبدیلی قبلہ کے ذریعے تم پر انعام کیا) جس طرح تم میں ایک رسول تم ہی میں سے معبوث کیا تا کہ وہ تمہیں ہماری آیات سنائے، تمہیں پاک کرے، تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور جو کچھ تم نہیں جانتے تھے، تمہیں اس کی تعلیم دے۔'' (بقرہ: ۱۵۱)

۴۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

''اے ہمارے رب! تو ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات سنائے، انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے، ان کا تزکیہ کرے۔ یقینا تو توانا اور حکیم ہے (اور اس کام پر قادر ہے)۔'' (بقرہ: ۱۲۹)

۵۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ﴿۹﴾ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ﴿۱۰﴾

''جس نے اپنے نفس کو پاک کرلیا، وہ فلاح پا گیا اور جس نے اپنے نفس کو گناہ سے آلودہ کیا، نا اُمید اور محروم ہوگیا۔'' (شمس ۹، ۱۰)

۶۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾

''یقینا جس نے تزکیہ نفس کیا، اپنے رب کے نام کا ذکر کیا اور نماز پڑھی، وہ فلاح پا گیا۔''

(اعلی: ۱۴، ۱۵)

۷۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ (لقمان: ۱۲)

''ہم نے لقمان کو حکمت (ایمان اور اخلاق) عطا کی (اور انہیں کہا) اپنے رب کا شکر ادا کرو۔''

پہلی چار آیات ایک ہی حقیقت کو بیان کر رہی ہیں، وہ یہ کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا ایک بنیادی مقصد لوگوں کا تزکیہ نفس اور ان کی تربیت اور اخلاق حسنہ کی ترویج تھا۔ حتی کہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تلاوتِ آیات الٰہی اور کتاب و حکمت کی تعلیم جس کا ذکر پہلی آیت میں آیا ہے، تزکیہ نفس اور انسانوں کی تربیت کے مقدمہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ وہی چیز ہے جو علم اخلاق کا اصلی مقصد ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ تین آیات میں تزکیہ کا ذکر تعلیم سے پہلے آیا ہے، اس لیے کہ مقصودِ آخر تزکیہ ہے، اگرچہ عملی طور پر تعلیم اس پر مقدم ہے۔

اگر ان آیات میں سے ایک آیت میں تعلیم کو تزکیۂ اخلاق سے پہلے بیان کیا گیا ہے تو اس میں اس بیرونی حقیقت کو مدنظر رکھا گیا ہے کہ عام طور پر تعلیم تزکیہ و تربیتِ نفس کا ذریعہ اور مقدمہ ہونے کی حیثیت سے مقدم ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ان چار میں سے پہلی تین آیات اور چوتھی آیت اس مسئلہ کے ان دو میں سے ایک پہلو کو مدنظر رکھے ہوئے ہیں۔

ان چار آیات کی تفسیر میں یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ اس تقدیم اور تاخیر کا مقصد یہ ہے کہ یہ تعلیم اور تربیت دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جس طرح صحیح تعلیم انسان کی اخلاقی سطح اور تزکیۂ نفس کی کیفیت کو بہتر کرتی ہے، اسی طرح اخلاقی فضائل بھی انسان کے علم و دانش کی سطح کو بلند کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں، اس لئے کہ انسان صرف اسی صورت میں علم کی حقیقت کو سکتا ہے جب وہ تکبر، ہٹ دھرمی، خود پسندی اور اندھے تعصب سے پاک ہو۔ اس لئے کہ یہ سب علمی ترقی کے راستے کی رکاوٹ ہیں، ورنہ یہ اخلاقی برائیاں انسان کے چشم و دل پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور وہ حق کو اس کی اصل صورت میں دیکھنے اور اسے قبول کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

مذکورہ بالا چار آیات میں یہ نکات بھی قابل غور ہیں:

پہلی آیت میں معلم اخلاق رسولؐ کی بعثت کو اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی اور تعلیم و تربیت کو ضلالِ مبین یعنی کھلی گمراہی کے مقابل قرار دیا گیا ہے۔ (وَاِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ)۔ یہ اخلاق کے بارے میں قرآن کے نہایت اہتمام کی نشاندہی کرتی ہے۔

دوسری آیت میں اخلاقی تربیت کرنے والے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دینے والے رسولؐ کو اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم احسان قرار دیا گیا ہے۔ یہ اخلاق کی اہمیت کی ایک اور دلیل ہے۔

تیسری آیت جو کہ تبدیلی قبلہ کی آیات کے بعد ہے اور تبدیلی قبلہ کو اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت قرار دے رہی ہے، یہ کہہ رہی ہے کہ یہ نعمت بھی بعثت رسولؐ اکرم کی نعمت کی مانند ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کا تزکیۂ نفس، تعلیم و تربیت کرے اور ایسی چیزوں

کی تعلیم دے جو معمولی ذرائع سے ممکن نہیں ہے۔[1]

ایک اور نکتہ جو چوتھی آیت میں قابل غور ہے کہ اس میں ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ سے فارغ ہو کر چند دعائیں مانگی ہیں جن میں سے سب سے اہم دعا ان کی ذریت میں سے ایک مسلمان امت کے معرضِ وجود میں آنے کی دعا اور ان میں کتاب وحکمت کی تعلیم دینے والے اور تزکیۂ نفس کرنے والے رسول کی بعثت کی دعا ہے۔

پانچویں آیت میں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن شریف گیارہ اقسام کے طولانی ترین مجموعہ کا ذکر کرنے کے بعد یہ فرما رہا ہے کہ ''جس نے تزکیۂ نفس کیا، وہ فلاح پا گیا اور جس نے نفس کو آلودہ کیا، وہ مایوس اور نا اُمید ہو گیا'' (قد افلح من زکھا۔ وقد خاب من دسھا)۔

یہ مسلسل تاکیدیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ قرآن مجید اخلاقی تربیت اور تزکیۂ نفس کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ گویا قرآن شریف کی نظر میں تمام اقدار اسی عظیم قدر میں سمو دی گئی ہیں اور اسی کو فلاح ونجات کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

ایک مختصر فرق کے ساتھ یہی بات چھٹی آیت میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اس میں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ اس میں تزکیۂ نفس کو نماز اور ذکرِ خدا پر مقدم رکھا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر فضائل اخلاقی کی روشنی میں انسان میں تزکیۂ نفس اور پاکیزگی قلب وروح نہ پائی جاتی ہو تو نہ ذکر خدا کسی کام آتا ہے اور نہ ہی نماز کسی روحانی منزل پر پہنچاتی ہے۔ آخری آیت میں عظیم معلم اخلاق کا ذکر کیا گیا ہے اور علم اخلاق کو حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ

''ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی اور انہیں حکم دیا کہ اس عظیم نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرو۔''

سورۂ لقمان کی اس آیت کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ ان کی امتیازی خصوصیت تربیت نفوس اور تربیت اخلاق تھی۔ لہٰذا یہ بات طے ہے کہ یہاں حکمت سے مراد ''حکمت عملی'' اور وہ تعلیمات ہیں جو اس حکمت عملی تک پہنچاتی ہیں۔ بالفاظ دیگر حکمت سے مراد ہے ''تعلیم وتربیت''۔

یہ نکتہ ضرور مدنظر رہے کہ جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ بنیادی طور پر حکمت کے معنی لگام کے ہیں۔ اس کے بعد یہ لفظ ہر اس چیز کیلئے استعمال کیا جانے لگا جو ''روکنے'' کی صلاحیت رکھتی ہے۔ چونکہ علم ودانش اور اخلاقی فضائل انسان کو برائی اور انحراف سے روکتے ہیں، اس لئے ان کو بھی حکمت کا نام دیا گیا ہے۔

---

[1] وَيُعلمكم مالم تكونوا تعلمون یعنی وہ تمہیں ان چیزوں کے تعلیم دیتا ہے جن کو معمول کے ذرائع سے جاننا تمہارے لئے ممکن نہ تھا۔ پس غور کرتو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایسی چیزوں کی تعلیم کا ذکر کیا گا ہے جن کا جاننا وحی کے بغیر ناممکن ہے۔

نتیجہ

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات واضح ہو کہ سامنے آتی ہے کہ قرآن مجید نے اخلاقی مسائل اور تہذیب نفس کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور اسے ایک ایسا بنیادی امر قرار دیا ہے جو دیگر تمام امور کی اساس اور بنیاد ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ تمام اسلامی قوانین و احکام پر سایہ فگن ہے۔

بلاشبہ اخلاقی ارتقاء خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، آسمانی ادیان کا بنیادی مقصد، تمام معاشرتی اصلاحات کی اساس اور ہر برائی کے خلاف جہاد کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

اب ہم احادیث کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ احادیث میں اس مسئلہ کو کیا اہمیت دی گئی ہے۔

اسلامی روایات میں اخلاق کی اہمیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی احادیث میں اس موضوع کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔

ہم یہاں نمونہ کے طور پر چند احادیث بیان کرتے ہیں:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث ہے:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق [۱]

یعنی ''میں صرف اخلاقی فضائل کی تکمیل کیلئے معبوث ہوا ہوں۔''

ایک اور روایت میں:

انما بعثت لاتمم حسن الاخلاق [۲]

ایک اور روایت میں:

بعثت بمکارم الاخلاق و محاسنها [۳]

کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

''انما'' کا لفظ حصر کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے تمام مقاصد کا خلاصہ انسانی اخلاق کی تکمیل تھا۔

---

[۱] کنز العمال 16:3 حدیث: 52157

[۲] کنز العمال 16:3 حدیث: 5218

[۳] بحار الانوار 05:66

۲۔ امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ایک روایت میں ہے:

لو کنا لا نرجو جنة ولا نخشی نارا ولا ثوابا ولا عقابا لکان ینبغی لنا ان نطالب بمکارم الاخلاق فانها مما تدل علی سبیل النجاح[۱]

''اگر ہمیں جنت کی امید اور جہنم کا خوف نہ ہوتا اور ثواب وعقاب کی بھی کوئی بات نہ ہوتی تو بھی ہمیں چاہئے تھا کہ اخلاقی فضائل کی طلب کرتے، اس لئے کہ یہی نجات اور کامیابی کیلئے رہنما ہیں۔''

یہ حدیث بخوبی اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ اخلاقی فضائل نہ صرف نجات اخروی کا ذریعہ ہیں بلکہ ان کے بغیر دنیوی زندگی کی بھی اصلاح ممکن نہیں ہے۔(اس بارے میں ہم آئندہ صفحات میں انشاءاللہ تفصیل سے بحث کریں گے)۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور حدیث میں آیا ہے:

جعل الله سبحانه مکارم الاخلاق صلة بینه و بین عباده فحسب احد کم ان یتمسك بخلق متصل بالله

یعنی ''اللہ تعالیٰ نے اخلاقی فضائل کو اپنے اور بندوں کے درمیان تعلق کا ذریعہ قرار دیا ہے۔لہٰذا یہی وجہ کافی ہے کہ تم اخلاقی فضائل کو اختیار کرو تا کہ وہ تمہیں اللہ سے متصل کر دیں۔''[۲]

دوسرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ سب سے بڑا معلم اخلاق اور مربی نفوس اور تمام فضائل کا سرچشمہ ہے۔اخلاق الٰہی کے بغیر قربِ خدا کا حصول ممکن نہیں ہے۔

بنا برایں ہر اخلاقی فضیلت اللہ اور انسان کے درمیان ایک تعلق پیدا کرتی ہے اور اسے قدم بقدم اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدس کے قریب کرتی ہے۔

آئمہؑ دین کی ساری زندگی اسی حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ انہوں نے ہر مقام پر لوگوں کو فضائل اخلاق کی طرف دعوت دی اور خود بھی فضائل اخلاق کا اسوۂ حسنہ تھے۔انشاءاللہ ہم آئندہ مباحث میں ان کے اخلاق کریمہ کی مثالیں دیکھیں گے۔اس سلسلہ میں یہی بات کافی ہے کہ قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام باعظمت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝

یعنی ''آپ اخلاق عظیم کی منزل پر فائز ہیں۔''(قلم:۴)

---

[۱] مستدرک الوسائل 2:283 (پرنا ایڈیشن)

[۲] تنبیہ الخواطر 362

اہم نکات

ا۔علم اخلاق کی تعریف

یہاں پر ہر بات سے پہلے یہ بات ضروری ہے کہ ہم اخلاق کی تعریف کریں۔''اخلاق''،''خلق''اور''خلق'' کی جمع ہے۔ مفردات راغب میں ہے کہ ان دونوں الفاظ کا مادہ ایک ہی ہے۔''خلق'' انسان کی ظاہری شکل اور صورت کو کہتے ہیں جبکہ ''خلق'' باطنی صفات وخصوصیات کو کہا جاتا ہے جن کا مشاہدہ صرف قلب کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔

اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ''اخلاق انسان کی روحی اور باطنی صفات کو کہتے ہیں۔'' چند ایک علماء کے مطابق بعض اوقات انسان کے ان افعال پر بھی لفظ اخلاق کا اطلاق ہوتا ہے جو اس کے باطنی اخلاق کی بنیاد پر صادر ہوتے ہیں۔اول الذکر کو صفاتی اخلاق اور ثانی الذکر کو عملی اخلاق بھی کہا گیا ہے۔

''اخلاق'' کی تعریف اس کے نتیجہ کے اعتبار سے بھی کی جاسکتی ہے۔وہ اس طرح کہ بعض اوقات انسان کسی ایسے فعل کو انجام دیتا ہے جو اس کے کردار کا مستقل حصہ نہیں ہوتا۔لیکن جب وہ کسی ایسے فعل کو انجام دیتا ہے جو اس کے کردار کا مستقل حصہ ہوتا ہے (مثلاً بخل) تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ فعل اس شخص کے باطن میں جڑیں رکھتا ہے۔ایسی جڑوں کو خلق اور اخلاق کہا جاتا ہے۔

اسی چیز کے پیش نظر ابن مسکویہ اپنی کتاب''تہذیب الاخلاق وتطہیر الاعراق''میں کہتے ہیں:

''خلق وہ نفسانی حالت ہے جو انسان کو مختلف کاموں کے انجام دینے کی دعوت دیتی ہے،بغیر اس کے کہ اسے غور وفکر کی ضرورت ہو۔''[1]

فیض کاشانی نے بھی اپنی کتاب''حقائق''میں اس بات کو اس طرح بیان کیا ہے:

''خلق اس پائیدار نفسی کیفیت کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کسی کام کو غور وفکر کے بغیر اور آسانی سے انجام دے سکتا ہے۔''[2]

اسی لئے اخلاق کو دو اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔وہ ملکات (پختہ باطنی خصوصیات) جن کی بدولت اچھے اعمال ظہور پذیر ہوتے ہیں،انہیں اخلاق حسنہ اور ملکاتِ فضیلہ کہا جاتا ہے اور وہ ملکات جو برے اعمال کے ظہور پذیر ہونے کا سبب ہوں،انہیں اخلاق بد اور ملکات رذیلہ کہا جاتا ہے۔

بنابرایں علم اخلاق کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے:

---

[1] تہذیب الاخلاق 51

[2] حقائق۔54

''علم اخلاق وہ علم ہے جو اچھے اور برے ملکات، خصوصیات، اسباب اور نتائج سے بحث کرتا ہے۔''

بالفاظ دیگر: علم اخلاق اچھی صفات کے حصول اور بری صفات کے خلاف مجاہدہ کے طریقوں اور ہر ایک کے انفرادی و اجتماعی اثرات سے بحث کرتا ہے۔

البتہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، ان صفات کی بنیاد پر انجام پانے والے اعمال وافعال پر بھی اخلاق کا اطلاق ہوتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص ہمیشہ غصے کا مظاہرہ کرے تو اسے اخلاق رذیلہ کہا جائے گا، اس کے برعکس بخشش اور سخاوت کو اخلاق حسنہ کہا جائے گا۔ درحقیقت یہ دونوں ایک دوسرے کا سبب اور نتیجہ ہیں جنہیں ایک دوسرے کا نام دیا گیا ہے۔

بعض مغربی مفکرین نے بھی علم اخلاق کی تعریف اس انداز میں کی ہے جس کا نتیجہ ہماری تعریفات سے ہم آہنگ ہے۔ جیکس اپنی کتاب ''فلسفۂ اخلاق'' میں کہتا ہے کہ ''علم اخلاق انسان کے طرزِ عمل سے، جیسا کہ اسے ہونا چاہئے، بحث کرتا ہے۔''[1]

بعض دیگر مفکرین نے مختلف تعریفیں بیان کی ہیں مثلاً فولکیہ کہتا ہے:

''ان قوانین کا مجموعہ جن کی پیروی کر کے انسان اپنے مقصد تک پہنچ سکتا ہے، علم اخلاق کہلاتا ہے۔''[2]

یہ ان لوگوں کی بات ہے جو اعلیٰ انسانی اخلاق کیلئے کسی اہمیت کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان کی نظر میں مقصد تک پہنچنا ہی سب سے اہم ہوتا ہے، خواہ مقصد کیسا ہی کیوں نہ ہو اور ان کی نظر میں اخلاق حصولِ مقصد کے ذریعہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۲۔ فلسفہ اور اخلاق کا تعلق

فلسفہ کی تعریف میں یہ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد انسان کی توانائی کے مطابق سارے جہان سے آگاہی حاصل کرنا ہے۔ اس تعریف کی بنیاد پر تمام علوم اس کلی تعریف کے دائرے میں واقع ہوتے ہیں۔ اسی لئے گزشتہ ادوار میں علوم کی تعداد کم تھی اور ان کا دائرۂ کار بھی محدود تھا۔ علم فلسفہ ان سب علوم کو زیر بحث لاتا تھا اور فلسفی اس شخص کو کہا جاتا تھا جو مختلف علوم سے آگاہی رکھتا تھا۔ اس دور میں فلسفہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا:

(الف) وہ امور جو انسان کی قدرت اور اختیار سے باہر ہیں اور انسان کے افعال کے علاوہ ہر چیز ان میں داخل ہے۔

(ب) وہ امور جو انسان کے اختیار اور اس کی قدرت کے دائرہ میں واقع ہیں، یعنی انسانی افعال۔

پہلے حصے کو حکمت نظری کہا جاتا تھا اور اسے مزید تین شاخوں میں تقسیم کیا جاتا تھا:

۱۔ فلسفہ اولیٰ یا حکمت الٰہی جو وجود کے عمومی احکام اور کائنات کے آغاز وانجام کے بارے میں بحث کرتا تھا۔

۲۔ طبیعیات، جس کی بہت سی شاخیں تھیں۔

---

[1] فلسفہ اخلاق۔9

[2] الاخلاق النظریہ۔10

۳۔ ریاضیات، اس کی بھی متعدد شاخیں تھیں۔

دوسرا حصہ جو انسان کے افعال سے متعلق ہے، اسے حکمت عملی کہا جاتا تھا اور اس کی بھی تین شاخیں تھیں:

۱۔ اخلاق، اس سے مراد وہ افعال ہیں جو انسان کی سعادت اور ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں اور ان کی جڑیں انسان کے اندر ہوتی ہیں۔

۲۔ تدبیر منزل، اس سے مراد وہ تمام امور ہیں جو گھریلو زندگی کے انتظام وانصرام سے تعلق رکھتے ہیں۔

۳۔ سیاست اور تدبیر مدن، یہ شعبہ انسانی معاشرے کے امور کے انتظام وانصرام سے بحث کرتا ہے۔

اس طرح اخلاق کو ایک انفرادی معاملہ سمجھ کر اسے خاندان اور معاشرے کے امور یعنی تدبیر منزل اور سیاست مدن کے برابر رکھا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے علم اخلاق، فلسفہ عملی یا حکمت عملی کی ایک شاخ ہے۔

لیکن چونکہ دورِ حاضر میں علوم کی متعدد شاخیں وجود میں آ چکی ہیں اور اسی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں، لہٰذا فلسفہ کا نام صرف پہلے حصہ یعنی حکمت نظری کی پہلی شاخ سے مخصوص ہو چکا ہے۔ بالفاظ دیگر اب فلسفہ کا اطلاق صرف اس علم پر ہوتا ہے جو کائنات کے کلی امور اور اس کے آغاز وانجام سے بحث کرتا ہے۔

اس مسئلہ پر فلاسفہ کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کہ حکمت نظری کا مقام ومرتبہ زیادہ ہے یا حکمت عملی کا۔ بعض حکمت نظری کو افضل سمجھتے ہیں جبکہ بعض کی نظر میں حکمت عملی برتر ہے۔ اگر مختلف زاویوں سے دیکھا جائے تو دونوں کا نکتہ نظر صحیح ہے لیکن اس موقع پر یہ بحث مناسب نہیں ہے۔

''فلسفہ'' اور ''اخلاق'' کے باہمی ربط وتعلق کے بارے میں انشاء اللہ مختلف مناسبتوں سے بات ہوتی رہے گی۔

۳۔ اخلاق اور عرفان کا تعلق

اخلاق وعرفان یا بالفاظ دیگر اخلاق اور سیر وسلوک الی اللہ کے باہمی تعلق کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ عرفان کی نظر زیادہ تر معارفِ الٰہی پر ہے اور وہ بھی از راہِ علم واستدلال نہیں بلکہ از راہِ کشف وشہودِ باطنی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا قلب اس طرح پاک اور نورانی ہو جائے، اس کی چشم حقیقت کھل جائے اور اس کے حجابات اس طرح برطرف ہو جائیں کہ وہ چشم دل سے اللہ تعالیٰ کی پاک ذات اور اس کے اسماء اور صفات کا مشاہدہ کرے اور اس سے عشق کرنے لگے۔

واضح سی بات ہے، چونکہ علم اخلاق ناپسندیدہ اخلاقی صفات کو، جو کہ چشم دل پر پردہ پڑ جانے کی بنیادی وجہ ہے، دور کرنے میں مدد دیتا ہے، لہٰذا وہ عرفان الٰہی کے ستونوں میں سے ایک ستون اور اس کے مقدمات میں سے ایک مقدمہ ہے۔

دوسری طرف سیر وسلوک الی اللہ، جس کا آخری مقصد معرفت خدا اور قربِ خدا کا حصول ہے، وہ درحقیقت عرفان واخلاق کا مجموعہ ہے۔ باطنی سیر وسلوک ایک قسم کا عرفان ہے جو انسان کو روز بروز اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس سے نزدیک تر کرتا ہے۔ حجابات کو

برطرف کرتا ہے اور واصل حق ہونے کی راہ ہموار کرتا ہے جبکہ بیرونی سیر وسلوک اخلاق ہی ہے۔ ایسا اخلاق جس کا مقصد تہذیب وتزکیہ نفس ہے، نہ کہ صرف مادی زندگی کو بہتر کرنا۔

۴۔ اخلاق اور علم کا تعلق

گزشتہ صفحات میں ہم نے جن آیات کے بارے میں بحث کی، وہ کتاب وحکمت کی تعلیم اور تزکیہ نفس کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رکھتی نظر آتی ہیں۔ کبھی تزکیہ نفس تعلیم پر مقدم نظر آتا ہے تو کہیں اس کے برعکس تعلیم کو تزکیہ نفس پر مقدم رکھا گیا ہے۔ اس سے ان دونوں کے گہرے اور اٹوٹ تعلق کی نشاندہی ہوتی ہے۔

یعنی جب انسان اچھے اور برے اعمال اور اچھی اور بری اخلاقی صفات کا علم حاصل کرتا ہے اور فضائل اور رذائل اخلاقی کے نتائج سے آگاہ ہوتا ہے تو اس کا یقیناً اس کی تربیت اور پرورش پر اثر ہوتا ہے۔ یہ کہنا بالکل بجا اور درست ہے کہ عمل اور اخلاق کی بہت سی برائیاں جہالت اور نادانی سے جنم لیتی ہیں۔ لہٰذا اگر جہالت اور نادانی کی جگہ علم وآگہی کی حکمرانی قائم ہو جائے، یا بعبارتِ دیگر معاشرے کی ثقافتی سطح اونچی ہو جائے تو بہت سی برائیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی اور ان کی جگہ خوبیاں لے لیں گی اور بہت سے اخلاقی مفاسد کا خاتمہ ہو جائے گا اور ان کی جگہ اخلاقی محاسن لے لیں گے۔ لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ کوئی کلی ضابطہ اور قانون نہیں ہے۔

بدقسمتی سے اس معاملہ میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے افراط کا راستہ اختیار کیا اور بعض تفریط کے راستے پر چل نکلے۔

بعض نے معروف یونانی فلسفی سقراط کی پیروی کا راستہ اختیار کیا، سقراط کا عقیدہ یہ تھا کہ علم وحکمت اخلاقِ حمیدہ کا سرچشمہ ہیں اور رذائل اخلاقی کی بنیاد جہل ونادانی ہے۔ سقراط کے پیروکار بھی کہتے ہیں کہ اخلاقی برائیاں ختم کرنے کیلئے واحد راستہ یہ ہے کہ معاشرے میں علم وآگہی کی سطح کو بلند کیا جائے۔ ان کے نکتہ نظر سے فضیلت مساوی ہے علم ومعرفت کے۔

ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص علم وآگہی کے ہوتے ہوئے بدی اور شر کی طرف نہیں جاتا اور اگر کوئی نیکی کو پہچان لے تو اس کو ترک نہیں کرتا۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ اپنی اور دوسروں کی علمی سطح کو بلند کرنے کی کوشش کریں۔ خیر وشر کے نتائج اور بدی ونیکی کے اثرات کا علم حاصل کریں تاکہ ہمارے وجود کی شاخوں پر فضائل اخلاقی کی کونپلیں نمودار ہو جائیں۔

اس کے برعکس ایک گروہ علم اور اخلاق کے باہمی تعلق کا سرے سے منکر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بدکار لوگوں کو علم وآگاہی دینے کا اس کے سوا کچھ نتیجہ نہیں ہوتا کہ وہ زیادہ ہوشیاری اور چالاکی سے جرائم کرنے لگتے ہیں۔ ضرب المثل ہے کہ اگر چوروں کو روشنی کی مدد حاصل ہو جائے تو وہ چن چن کر قیمتی چیزیں چرائیں گے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم اور اخلاق کے تعلق کا نہ تو مکمل طور پر انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اخلاق کو سو فیصد علم کا ثمر اور نتیجہ قرار

دیا جا سکتا ہے۔ ہمارے معاشرتی تجربات بھی اسی حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ہم معاشرے میں ایسے بہت سے افراد کو دیکھ سکتے ہیں جو بدعمل تھے لیکن جب انہیں اپنے برے اعمال کے برے نتائج کا علم حاصل ہو گیا تو انہوں نے برائی کو چھوڑ دیا اور نیکی کی طرف رخ کر لیا۔ ہم خود اپنی زندگی میں بھی اس چیز کا تجربہ رکھتے ہیں۔

اس کے برعکس ایسے افراد بھی موجود ہیں جو اچھے اور برے اعمال کی اچھائی اور برائی اور ان کے نتائج و اثرات کا علم رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود برائی کے راستہ پر چلتے جا رہے ہیں اور اخلاقِ رذیلہ ان کے وجود پر حاکم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ایک ایسا موجود ہے جو دو پہلو رکھتا ہے۔ اس کی شخصیت اور وجود کا ایک پہلو علم و آگہی سے تشکیل پاتا ہے اور دوسرا پہلو اس کی جبلی خواہشات سے تشکیل پاتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کبھی پہلے پہلو کو ترجیح دیتا ہے اور کبھی دوسرے پہلو کو۔

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جن لوگوں نے علم و اخلاق کے باہمی تعلق کے حوالہ سے مندرجہ بالا دو میں سے کسی ایک نظریے کو اختیار کیا ہے، وہ انسان کی شخصیت کے ایک ہی پہلو کے معترف ہیں اور دوسرے پہلو کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔

قرآن شریف کی بعض آیات بھی اسی بات پر دلالت کرتی ہیں جو ہم نے بیان کی ہیں۔ قرآن مجید نے کئی آیات میں جہالت اور برائی کے باہمی تعلق کی طرف اشارہ کیا ہے، مثلاً

اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾

''تم میں سے جو بھی جہالت کی وجہ سے برے کام کا مرتکب ہو، پھر توبہ اور اصلاح کر لے تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے۔'' (انعام: ۵۵)

ایسی ہی بات سورۂ نساء کی آیت ۱۷ اور سورۂ نحل کی آیت ۱۱۹ میں بھی کہی گئی ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ یہاں جہل سے مراد وہ جہلِ مطلق نہیں ہے، جو توبہ کے ساتھ سازگار نہیں ہے بلکہ اس سے مراد جہالت کے درجات میں سے وہ درجہ ہے کہ اگر وہ برطرف ہو جائے تو انسان حق کی طرف آ جاتا ہے۔

پیام قرآن کے پہلے دورہ کی پہلی جلد میں، جہاں ہم نے معرفت اور شناخت کی بحث کی ہے، ہم نے ایسی بہت سی آیات درج کی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جہل، کفر کا سرچشمہ ہے، جہل برائیوں کا سرچشمہ ہے، جہل ہٹ دھرمی، ضد، تعصب اور بہانہ جوئی کا سرچشمہ ہے۔ اندھی تقلید، اختلاف و انتشار، سوءظن اور بدگمانی، گستاخی اور بے ادبی ہے۔ غرضیکہ سب بری صفات کی بنیاد جہل ہے جو تمام اقدار کو تہہ و بالا کر دیتا ہے۔ [1]

دوسری طرف بہت سی آیات واضح اور صریح طور پر یہ کہتی ہیں کہ ''بعض لوگ علم و آگہی کے باوجود غلط راستے پر چلتے ہیں۔ مثلاً آلِ فرعون کے بارے میں فرمایا:

---

[1] پیام قرآن دورہ اول جلد 1 ص 86 تا 98

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ

''انہوں نے یقین رکھتے ہوئے ظلم اور سرکشی کی وجہ سے ہماری آیات کا انکار کیا۔''(نمل:۱۴)

اہل کتاب کے ایک گروہ کے بارے میں فرمایا:

وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۷۵

''وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں حالانکہ اس کا علم رکھتے ہیں۔''(آل عمران:۷۵)

اس کے بعد کی چند آیات میں بھی ایسی ہی بات کہی گئی ہے، مثلاً

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۷۸

''اور بے شک ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ کج کرتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب (پڑھنے) میں تا کہ تم لوگ اس (ملائی ہوئی چیز) کو (بھی) کتاب کا جزو سمجھو حالانکہ وہ کتاب کا جزو نہیں اور کہتے ہیں کہ (یہ لفظ یا مطلب) خدا کے پاس سے ہے حالانکہ وہ (کسی طرح) اللہ تعالیٰ کے پاس سے نہیں اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔''(آل عمران:۷۸)

ممکن ہے اس آیت میں جس علم و آگہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ جھوٹ کے بارے میں نہ ہو لیکن اس کے باوجود یہ آیت ہمارے دعویٰ کی دلیل ہے، اس لئے کہ جھوٹ کا برا ہونا اور اس کے بارے میں عقل و شریعت کا حکم کسی پر مخفی نہیں ہوسکتا۔

روزمرہ کے تجربات بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اخلاقِ رذیلہ سے آگہی بہت سے مقامات پر انسان کو برائی سے روکنے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن اس کے باوجود بہت سے مقامات پر آگاہ افراد بھی برے اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں اور اخلاقِ رذیلہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ لہٰذا یہاں پر دونوں مکاتب فکر کے درمیان والا مکتبہ فکر حقیقت کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

۵۔ آیا اخلاق میں تبدیلی ممکن ہے؟

علم اخلاق اور تمام اخلاقی مباحث کی قسمت کا دارومدار اسی مسئلہ پر ہے، اس لئے کہ اگر اخلاق میں تبدیلی ممکن نہ ہو تو نہ صرف یہ کہ علم اخلاق ایک بے معنی اور بیہودہ علم بن جائے گا بلکہ تمام انبیاء کی بعثت اور تمام آسمانی کتب کا نزول بھی بے مقصد ہو جائے گا اور برائی سے روکنے والی تمام سزائیں بھی بے معنی ہو جائیں گی۔

لہٰذا انبیاء کی تعلیمات اور آسمانی کتب میں جو اخلاقی اور تربیتی نظام دیئے گئے ہیں اور دیگر تمام مذاہب میں برائی سے

روکنے کیلئے جوسزائیں مقرر کی گئی ہیں، وہ سب اس بات کا بہترین ثبوت ہیں کہ اخلاق میں تبدیلی ممکن ہے۔ اخلاقی طریقے صرف انبیاءنہیں بلکہ تمام عقلاء کے یہاں بھی قابل قبول واقع ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود تعجب ہوتا ہے کہ فلاسفر اور علمائے اخلاق نے اس موضوع پر بہت بحث کی ہے کہ آیا اخلاق میں تبدیلی ممکن ہے یا نہیں؟

بعض یہ کہتے ہیں کہ اخلاق میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ برے اور بدطینت لوگ ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ اگر ان میں کوئی تبدیلی آ بھی جائے تو وہ سطحی اور ناپائیدار ہوتی ہے اور جلد ہی وہ پہلی حالت پر لوٹ آتے ہیں۔ ان کے پاس اپنے مؤقف کی تائید میں دلائل بھی ہیں جن میں سے ایک یہ کہ جسم اور جان کی ساخت کا اخلاق کے ساتھ قریبی تعلق ہے اور ہر شخص کا اخلاق اس کی روح اور جسم کی خلقت کے تابع ہے۔ جس طرح روح اور جسم میں تبدیلی ممکن نہیں ہے، اسی طرح اس کے اخلاق میں تبدیلی کا بھی کوئی امکان نہیں ہے۔

اس طرزِ تفکر کے حامل بعض شعراء نے اپنے اشعار میں وسیع پیمانے پر اشارہ کیا ہے۔ (اگرچہ ممکن ہے کہ ان کے اشعار کو اس بارے میں مبالغہ پر محمول کیا جائے)۔

بعض معروف شعراء کے اشعار کے نمونے ملاحظہ فرمائیے:

پر تو نیکان نگیرد ہر کہ بنیادش بداست
تربیت نا اہل را چون گردگان برگنبداست
شمشیر نیک ز آہن بد چون کند کسی؟
ناکس بہ تربیت نہ شودای حکیم کسی

''ناقص لوہے سے اچھی تلوار کیسے بنائی جاسکتی ہے؟ اے حکیم! تربیت کے ذریعے نا اہل کو اہل نہیں بنایا جاسکتا۔''

باران کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و درشورہ زار خس

''اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ بارش کی طبیعت میں لطافت پائی جاتی ہے۔ لیکن باغ میں پھول اگتے ہیں اور شورزمین میں صرف خس وخاشاک۔''

برسیہ دل چہ سود خواندن وعظ
نرود میخ آہنین درسنگ
آہنی را کہ موریانہ بخورد
نتوان برداز آن بہ صیقل رنگ

''جس کا دل سیاہ ہو، اسے وعظ ونصیحت کا کیا فائدہ، اس لئے کہ آہنی میخ کبھی پتھر میں نہیں جاتی۔ جس لوہے کو دیمک لگ جائے، اس کو چمکا کر اس کا زنگ نہیں اتارا جاسکتا۔''

چون بود اصل گوہری قابل
تربیت را در اوائر باشد
ہیچ صیقل نکو ندارد کرد
آہنی را کہ بد گہر باشد
سگ بہ دریای ہفت گانہ مشوء
کہ چو ترشد پلید تر باشد
خر عیسیٰ گرش بہ مکہ برند
چون بیاید ہنوز خر باشد

''اگر اصل گوہر قابل ہوتو تربیت اس پر اثر کرتی ہے۔ کسی قسم کا صیقل اس لوہے کو نہیں چمکا سکتا جو اصل میں برا ہو۔ کتے کو سات سمندروں سے مت دھوؤ، اس لئے کہ وہ گیلا ہوکر اور بھی نجس ہوجاتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے گدھے کو اگر مکہ بھی لے جائیں تو واپس آ کر گدھا ہی رہے گا۔''

اپنے اس مؤقف کی تائید میں ایک اور دلیل جو اس مکتبہ فکر کے افراد دیتے ہیں، وہ یہ ہے کہ وعظ ونصیحت اور سزا کے خوف جیسے بیرونی عوامل کی وجہ سے اگر اخلاق میں تبدیلی آ بھی جائے تو ان عوامل کے زائل ہوجانے کے بعد انسان اپنی اصل اخلاقی حالت کی طرف پلٹ جاتا ہے، جیسا کہ پانی کی ٹھنڈک حرارت کی وجہ سے ختم ہوجاتی ہے لیکن جیسے ہی حرارت ختم ہوتی ہے، پانی اپنی اصل ٹھنڈک کی طرف پلٹ جاتا ہے۔

یہ طرزِ فکر اور یہ استدلال انسانی معاشرے کی بدقسمتی اور انحطاط کا سبب ہے۔ اخلاقی صفات میں ''تبدیلی کی قابلیت'' کے حامی مندرجہ بالا دو دلیلوں کا جواب اس طرح دیتے ہیں:

ا۔ انسان کے اخلاق اور اس کی روح وجسم کے باہمی تعلق کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ تعلق ایک طبیعی تقاضہ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ انسان کے اخلاق کی علت تامہ نہیں ہے۔ یعنی اخلاقی صفات کے حصول کا زینہ تو فراہم کرسکتا ہے لیکن کسی خاص اخلاقی صفت کے حصول پر انسان کو مجبور نہیں کرسکتا۔ جس طرح بعض بیماریوں میں مبتلا والدین کے بچوں میں اس بیماری کے پیدا ہونے کا امکان تو ہوتا ہے مگر ضروری نہیں کہ وہ بیماری بہرحال ان میں پیدا ہوجائے کیونکہ احتیاطی تدابیر اختیار کرکے ان موروثی بیماریوں کی روک تھام کی جا سکتی ہے۔

کمزور افراد صحت کے اصولوں کی پابندی اور مناسب ورزش کے ذریعے طاقتور بن جاتے ہیں۔اس کے برعکس طاقتور افراد ان چیزوں کے ترک کر دینے سے کمزور ہو جاتے ہیں۔

علاوہ برایں انسان کے جسم اور روح میں بھی تبدیلی ممکن ہے۔لہٰذا ان سے معرضِ وجود میں آنے والے اخلاق میں بھی تبدیلی ممکن ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ آج کے تمام پالتو جانور ایک دن وحشی تھے۔انسان نے انہیں پکڑ کر سدھار لیا اور وہ پالتو جانور بن گئے۔ بہت سے پودوں اور درختوں میں بھی یہی خاصیت پائی جاتی ہے۔اگر تربیت کے ذریعے ایک جانور اور پودے کی خصوصیات بدلی جا سکتی ہیں تو انسان کے اخلاق میں تبدیلی کیوں نہیں لائی جا سکتی؟ اب بھی بہت سے جانوروں کو ایسے کاموں کی تربیت دی جاتی ہے جو ان کی طبیعت کے خلاف ہیں اور وہ ان کاموں کو بخوبی انجام دیتے ہیں۔

۲۔ مذکورہ بالا جواب سے ہی ان کے دوسرے استدلال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے،اس لئے کہ بعض اوقات بیرونی عوامل کی تاثیر اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ ذاتی خصوصیات مکمل طور پر تبدیل ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی تبدیلی آنے والی نسلوں میں بھی منتقل ہو جاتی ہے جس کا مشاہدہ پالتو جانوروں کی زندگی میں کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ میں بہت سے ایسے انسان نظر آتے ہیں جن کے اخلاق تربیت کے نتیجہ میں مکمل طور پر تبدیل ہو گئے اور ان کی زندگی کے انداز و اسلوب میں ۱۸۰ درجے کی تبدیلی آ گئی۔اگر کچھ افراد کبھی ظالم لٹیرے تھے تو وہ مشہور و معروف عابد و زاہد بن گئے۔اگر ہم اس بات کی طرف دھیان دیں کہ ایک پختہ اخلاقی صفت کس طرح وجود میں آتی ہے تو ہمیں اس کے برطرف کرنے کا طریقہ بھی معلوم ہو جائے گا۔حقیقت یہ ہے کہ ہر اچھا اور برا عمل انسان کی روح پر اثر انداز ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ روح کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔اس عمل کے تکرار سے اس کا اثر بھی زیادہ اور گہرا ہو جاتا ہے۔آہستہ آہستہ انسان کے اندر ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جسے ''عادت'' کا نام دیا جاتا ہے۔جب عادت برقرار رہے تو وہ ایک پختہ ملکہ بن جاتی ہے۔

پس جس طرح تکرارِ عمل کے نتیجہ میں برے اخلاقی ملکات معرضِ وجود میں آ جاتے ہیں، اسی طرح انہیں ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔البتہ اچھے اخلاقی ملکات کی تشکیل کیلئے نصیحت، غور و فکر، صحیح تعلیمات اور صحت مند ماحول کی تاثیر اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس سلسلہ میں ایک تیسرا مکتب فکر بھی موجود ہے جو یہ کہتا ہے کہ بعض اخلاقی صفات میں تبدیلی ممکن ہے اور بعض میں نہیں۔ جو صفات فطری اور طبیعی ہوتی ہیں، ان میں تبدیلی ممکن نہیں ہوتی لیکن جو صفات بیرونی عوامل کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں، ان میں تبدیلی ممکن ہوتی ہے۔[1]

اس نظریہ کی تائید میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے، اس لئے کہ صفات کے درمیان اس فرق کا قائل ہونا طبیعی اور فطری

---

[1] محقق نراقی نے جامع السعادات میں اسی نظریہ کی تائید کی ہے۔(جامع السعادات جلد 1 ص 24)

اخلاق کی فرع ہے، حالانکہ یہ بات ثابت نہیں ہے۔ اگر بالفرض ثابت ہو بھی تو کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ فطری صفات میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ کیا جنگلی جانوروں کو پالتو جانور نہیں بنایا جا سکتا؟ کیا تعلیم و تربیت اس قدر گہری تاثیر کی حامل نہیں ہو سکتی کہ انسان کے وجود کی گہرائی میں جا کر تبدیلی کر دے؟

اخلاقی تبدیلی کے امکان پر آیات و روایات

جو کچھ ہم نے مذکورہ صفحات میں کہا، وہ عقلی اور تاریخی حوالے سے تھا۔ جب ہم نقلی دلائل یعنی وحی اور ارشاداتِ معصومین کی طرف رجوع کرتے ہیں تو مسئلہ اور بھی واضح ہو جاتا ہے، اس لئے کہ:

۱۔ انبیاء و رسل کی بعثت اور آسمانی کتب کا نزول، انسانوں کی ہدایت کا یہ سارا اہتمام اس بات کی مضبوط ترین دلیل ہے کہ تمام انسانوں میں فضائل اخلاقی کی پرورش ممکن ہے۔[1]

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (جمعه: ۲)

اور اس جیسی آیات اس بات کو بخوبی واضح کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا مقصد ان لوگوں کی ہدایت، تربیت اور تزکیہ نفس تھا جو ضلال مبین یعنی کھلی گمراہی میں تھے۔

۲۔ وہ تمام آیات جو یا بنی آدم، یا ایھا الناس اور یا عبادی جیسے الفاظ کے ذریعے تمام انسانوں کو خطاب کر کے امر و نہی کر رہی ہیں یا تزکیہ و تہذیب نفس پر مشتمل مطالب کو بیان کر رہی ہیں۔ اخلاق رذیلہ کی تبدیلی اور ناپسندیدہ صفات کی اصلاح کے ممکن ہونے کی بہترین دلیل ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان خطابات کی یہ عمومیت لغو اور بیہودہ ہوتی۔

ممکن ہے اس کے جواب میں کوئی شخص یہ کہہ دے کہ یہ تمام آیات عملی احکام پر مشتمل ہیں جبکہ اخلاق کا تعلق اندرونی صفات سے ہے۔

لیکن اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ اخلاق اور عمل لازم و ملزوم ہیں اور ایک دوسرے کیلئے علت اور معلول یعنی سبب اور نتیجہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہر اچھی اخلاقی صفت اچھے اعمال کا سرچشمہ ہوتی ہے جبکہ ہر بری اخلاقی صفت برے افعال کا سبب ہوتی ہے۔ اس کے مقابل اچھے اور برے اعمال بار بار کی تکرار سے اچھے اخلاق میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

۳۔ یہ نظریہ کہ اخلاق میں تبدیلی ممکن نہیں ہے، عقیدۂ جبر کی پیداوار ہے۔ اس لئے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اچھے اور برے اخلاق کے حامل افراد اپنے اخلاق کو تبدیل کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ چونکہ ان کے اعمال ان کے اخلاق کی بنیاد پر استوار ہوتے

---

[1] ملاحظہ فرمائیے اصول کافی جلد 1 ص 155 اور کشف المراد، بحث قضاء و قدر و مفاسد جبر۔

ہیں، لہٰذا وہ اپنے اچھے یا برے افعال کے انجام دینے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس کے باوجود وہ مکلف ہیں کہ اچھے اعمال کو انجام دیں اور برے اعمال سے اجتناب کریں۔ یہ عین جبر ہے اور جتنی خرابیاں عقیدۂ جبر کی وجہ سے لازم آتی ہیں، اس نظریہ کی وجہ سے بھی لازم آتی ہے۔[1]

جو آیات وضاحت اور صراحت کے ساتھ تہذیب اخلاق کی طرف راغب کرتی ہیں اور رذائل اخلاقی سے اجتناب کی تاکید کرتی ہیں، وہ بھی اخلاقی صفات میں تبدیلی کے ممکن ہونے کی مضبوط دلیل ہیں۔ جیسا کہ:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝

''جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا، وہ فلاح پا گیا اور جس نے اسے گناہ سے آلودہ کیا، نا اُمید اور محروم ہو گیا۔'' (شمس: ۹، ۱۰)

اس آیت میں لفظ ''دسھا'' استعمال ہوا ہے جس کا مادہ ''دس'' ہے۔ لفظ ''دسیسہ'' بھی اسی سے نکلا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی ناپسندیدہ چیز کو کسی چیز میں داخل کر دیا جائے۔ اس آیت میں اس لفظ کا استعمال یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسانی طبیعت کی بنیاد پاکیزگی اور تقویٰ پر رکھی گئی ہے اور رذائل اخلاقی باہر سے اس میں داخل ہوتے ہیں اور دونوں میں تغیر و تبدل ممکن ہے۔ سورۃ فصلت کی آیت ۳۴ میں ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝

''بدی کو نیکی کے ذریعے دور کرو، تم اچانک دیکھو گے کہ جو شخص تمہارا دشمن تھا، گویا وہ تمہارا پرانا اور مخلص دوست ہے۔''

یہ آیت اس بات کو بخوبی ثابت کرتی ہے کہ پرانی اور گہری دشمنی جو انسان کے اخلاق پر گہرا اثر ڈالتی ہے، محبت اور اچھے سلوک کے نتیجہ میں گرم جوشی اور دوستی میں بدل جاتی ہے۔ اگر اخلاق میں تبدیلی ممکن نہ ہوتی تو یہ تبدیلی بھی ممکن نہ ہوتی۔

اسلامی احادیث میں بھی یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ مشہور و معروف حدیث

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (سفینۃ البحار، مادہ خلق)

اخلاق میں تبدیلی کے امکان کی بہترین مثال ہے۔

۲۔ بہت سی روایات حسن خلق کی ترغیب دیتی ہیں مثلاً یہ حدیث نبوی:

لو یعلم العبد ما فی حسن الخلق لعلم انه یحتاج ان یکون له خلق حس [1]

''اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ حسن اخلاق کے کیا فوائد ہیں تو انہیں یقین ہو جاتا کہ انہیں اچھے اخلاق کی ضرورت ہے۔''

۳۔ آنحضرتؐ سے ایک حدیث میں ہے:

الخلق الحسن نصف الدین [2]

''حسن اخلاق نصف دین ہے۔''

۴۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

الخلق المحمود من ثمار العقل، الخلق المذموم من ثمار الجهل [3]

''پسندیدہ اخلاق عقل کا ثمر ہے اور ناپسندیدہ اخلاق جہل کا ثمر ہے۔''

چونکہ علم اور جہل میں تبدیلی ممکن ہے، لہٰذا اخلاق جو ان کا ثمر ہے، اس میں بھی تبدیلی ممکن ہے۔

۵۔ ایک اور حدیث نبوی میں ہے:

ان العبد لیبلغ بحسن خلقه عظیم درجات الاخرة و شرف المنازل وانه لضعیف العبادة [4]

''انسان عبادت میں کمزور ہونے کے باوجود حسن اخلاق کی بدولت آخرت میں عظیم درجات اور اشرف منازل پر فائز ہوسکتا ہے۔''

اس حدیث میں حسن اخلاق کا عبادت کے ساتھ موازنہ کیا گیا ہے۔ اعلیٰ اخروی درجات کا ذکر کیا گیا ہے جو یقیناً اختیاری اعمال کا نتیجہ ہیں اور حسن اخلاق کے حصول کی رغبت دلائی گئی ہے جو ایک اکتسابی امر ہے جس میں کوئی اجبار و اکراہ نہیں ہے۔

اس قسم کی روایات و کلمات ارشاداتِ معصومین علیہم السلام میں بکثرت پائی جاتی ہیں [5] جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اخلاقی صفات میں تبدیلی ممکن ہے ورنہ یہ سب ترغیبات بے معنی اور لغو قرار پائیں گی۔

---

[1] بحار الانوار 10_369

[2] بحار الانوار 71:385

[3] غرر الحکم 1280_1281

[4] محجة البیضاء ﷺ 5 ﷺ 93

[5] اصول کافی جلد 2 میں مرحوم کلینی نے باب حسن خلق میں اس قسم کی 18 روایات نقل کی ہیں

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جریر بن عبداللہ سے فرمایا:

انك امرء قد احسن الله خلقك فاحسن خلقك [1]

''اللہ نے تجھے خوبصورت چہرہ عطا کیا ہے، تو اپنے اخلاق کو خوبصورت بنا۔''

مختصر یہ کہ کتب احادیث ایسی احادیث سے بھری پڑی ہیں جو اخلاق میں تبدیلی کے ممکن ہونے کو ثابت کرتی ہیں۔ [2]

ہم اس باب کو امیر المومنین علیہ السلام کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں جو فضائل اخلاق کے حصول کی رغبت دلا رہی ہے:

الكرم حسن السجية و اجتناب الدنية

''انسان کی بزرگی اس میں ہے کہ حسن خلق کو اختیار کرے اور اخلاقی پستی سے اجتناب کرے۔'' [3]

اخلاق میں عدم تغیر کے قائلین کے دلائل

مندرجہ بالا دلائل کے جواب میں کچھ ایسی روایات کا سہارا لیا گیا ہے جن سے پہلی نظر میں یہی ثابت ہوتا ہے کہ اخلاق میں تبدیلی ناممکن ہے:

۱۔ رسولؐ اللہ کی مشہور حدیث ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے:

الناس معادن كمعادن الذهب والفضة، خيارهم فى الجاهلية خيار هم فى الاسلام

''لوگ سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح ہیں، دورِ جاہلیت کے اچھے اسلام میں بھی اچھے ہیں۔''

۲۔ آنحضرتؐ سے ہی ایک اور حدیث میں مروی ہے:

اذا سمعتم ان جبلا زال عن مكانه فصدقوه، و اذا سمعتم برجل زال عن خلقه فلا تصدقوه! فانه سيعود الى ما جبل عليه

''جب تم سنو کہ پہاڑ نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہے تو اسے سچ سمجھ لو مگر جب یہ سنو کہ کسی نے اپنا اخلاق چھوڑ دیا ہے تو اسے سچ مت سمجھو۔ وہ جلدی اپنی فطرت پر لوٹ آئے گا۔'' [4]

---

[1] سفینۃ البحار، مادہ خلق

[2] اصول کافی جلد 2، روضہ کافی، میزان الحکمہ، ج 3 اور سفینۃ البحار کے متعلقہ ابواب کی طرف رجوع فرمائیں۔

[3] غرر الحکم۔

[4] جامع السعادات: 24:1

جواب

ان روایات کا جواب سابقہ روایات کی روشنی میں دینا مشکل نہیں ہے جن سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اخلاق میں تبدیلی ممکن ہے۔اس لئے کہ یہ بات قابل قبول ہے کہ لوگوں کی روحی کیفیات مختلف ہوتی ہیں۔بعض سونے کی کان جیسے ہوتے ہیں اور بعض چاندی کی کان کی مانند ہوتے ہیں۔لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ روحی کیفیات تبدیلی کو قبول نہیں کرتی ہیں۔یہ صفات مقتضی کی حیثیت رکھتی ہیں مگر علت تامہ نہیں ہوتی ہیں۔

لہٰذا یہ بات تجربے سے ثابت ہے کہ ایسے افراد تعلیم وتربیت کی روشنی میں مکمل طور پر تبدیل ہوجاتے ہیں۔اس کے علاوہ اگر ہم اسی حدیث کی روشنی میں فیصلہ کرنا چاہیں تو وہ اس طرح ہوگا کہ سب لوگ اچھے اخلاق کے مالک ہیں۔یعنی بعض خوب ہیں اور بعض خوب تر (سونے اور چاندی کی مانند)۔لہٰذا ان میں اخلاق رذیلہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

حدیث نمبر ۲ بھی مقتضی کی حیثیت رکھتی ہے، نہ علت تامہ کی یا دوسرے الفاظ میں لوگوں کی اکثریت کی حالت کو بیان کر رہی ہے، نہ سب کی حالت کو، ورنہ اس حدیث کا مضمون تاریخی طور پر غلط ہے، اس لئے کہ تاریخ یہ بات قطعی طور پر ثابت کرتی ہے کہ بہت سے لوگوں نے اپنے اخلاق میں تبدیلی کی اور مرتے دم تک اس پر قائم رہے۔ہمارا روزمرہ کا تجربہ بھی یہ بتلاتا ہے کہ بہت سے برے افراد تعلیم وتربیت کے نتیجہ میں اپنی زندگی کی راہ بدل لیتے ہیں اور عمر بھر نئے راستے پر قائم رہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ لوگوں کی روحی اور اخلاقی کیفیات مختلف ہونے کے باوجود کوئی شخص بھی کسی مخصوص اخلاقی روش پر قائم رہنے پر مجبور نہیں ہے۔عین ممکن ہے کہ اعلیٰ اخلاقی صفات کے حامل افراد ہوائے نفس کی پرستش کے نتیجہ میں اخلاقی انحطاط کی دلدل میں گر جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بری اخلاقی صفات کے حامل افراد استاد اور مربی کے زیر سایہ خودسازی کی منازل طے کر کے کمال کے اعلیٰ ترین درجات پر پہنچ جائیں۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ بعض فاسد اور مفسد افراد اپنے برے کردار پر یہ کہہ کر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم کیا کریں، ہمیں تو اللہ نے پیدا ہی اس طرح کیا ہے۔وہ چاہتا تو ہمیں کسی اور اخلاق پر پیدا کر دیتا۔

بہرحال عدم تغیر کا قائل ہونے کا نتیجہ عقیدۂ جبر کو تسلیم کرنے، انبیاء کے مکتب کے انکار، علمائے اخلاق اور ماہرین نفسیات کی کوششوں کو بیہودہ سمجھنے اور انسانی معاشرے کے فساد کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

۶۔علم اخلاق کی مختصر تاریخ

مذکورہ بالا بحث کو ہم علم اخلاق کی مختصر تاریخ بیان کرنے پر ختم کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اخلاقی بحث کا آغاز اسی وقت ہوگیا تھا جب انسان نے روئے زمین پر قدم رکھا تھا۔اس لیے کہ

ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے، انہوں نے نہ صرف اپنی اولاد کو اخلاقی تعلیمات سے آگاہ کیا بلکہ جب سے اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا اور انہیں جنت میں ٹھہرایا، اوامر و نواہی کے ذریعے انہیں اخلاقی مسائل سے آگاہ کر دیا۔

دیگر انبیاء بھی لوگوں کا تزکیہ نفس کرنے کے کاموں میں مشغول رہے جو کہ انسانوں کی سعادت کا ذریعہ ہے۔ یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ آ گیا جن کی تعلیمات کا بڑا حصہ اخلاقی مباحث پر مشتمل ہے۔ ان کے سب پیروکار انہیں علم اخلاق کے عظیم معلم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔

لیکن اخلاق کے سب سے عظیم معلم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے جو انما بعثت لا تمم مکارم الاخلاق کا پرچم لے کر مبعوث ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝

''اور یقیناً آپ خلق عظیم کی منزلت پر فائز ہیں۔'' (قلم: ۴)

فلاسفہ میں سے بھی بعض عظیم شخصیات معلم اخلاق کی حیثیت سے معروف تھیں جن میں افلاطون، ارسطو، سقراط اور یونان کے بعض دیگر فلاسفہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

بہر حال رسولؐ اللہ کے بعد آئمہ معصومین علیہم السلام اخلاق کے عظیم ترین معلم تھے۔ اس بات کا ثبوت اخلاقی روایات کا وہ عظیم ذخیرہ ہے جو ان سے نقل ہوا ہے۔ ان کے مکتب میں ایسی عظیم شخصیات نے پرورش اور تربیت پائی جن میں سے ہر ایک اپنے دور کا معلم اخلاق تھا۔

آئمہ معصومین علیہم السلام اور ان کے اصحابِ بافضیلت کی زندگی ان کے اخلاقی مقام و مرتبہ اور فضائل اخلاق کا روشن ترین ثبوت ہیں۔

یہ ایک مفصل داستان ہے کہ ''علم اخلاق'' کب اسلام میں پیدا ہوا اور یہ کہ اس علم کی مشہور شخصیات کون تھیں۔ آیت اللہ صدر نے اپنی گرانقدر تالیف ''تاسیس الشیعہ لعلوم الاسلام'' میں اس کی طرف مختصر اشارہ کیا ہے۔

موصوف نے اس موضوع کو تین حصوں میں تقسیم کیا:

(الف) وہ فرماتے ہیں کہ علم اخلاق کی بنیاد رکھنے والی اولین شخصیت امیر المومنین علی علیہ السلام کی ذات گرامی ہے جنہوں نے جنگ صفین سے واپسی پر امام حسن علیہ السلام کے نام اپنے معروف خط میں اخلاقی مسائل کی بنیادوں کو واضح فرمایا۔ اس خط میں اخلاقی فضائل اور صفات رذیلہ کا نہایت عمدہ انداز میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ [1]

اس خط کو سید رضی مرحوم نے نہج البلاغہ میں درج کیا ہے اور ان کے علاوہ بھی بہت سے شیعہ علماء نے اسے نقل کیا ہے۔ اہل

---

[1] حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کا رسالۃ الحقوق ان کی دعائے مکارم الاخلاق اور دیگر بہت سی دعائیں اور مناجات اخلاق اسلامی کے معروف مصادر میں سے ہیں جن کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

سنت کے بعض علماء مثلاً ابو احمد بن عبداللہ عسکری اپنی کتاب "الزواجر والمواعظ" میں اس خط کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اگر حکمت میں سے کوئی چیز سونے کے پانی سے لکھے جانے کے قابل ہے تو وہ یہی خط ہے۔

(ب) علم اخلاق کے عنوان سے لکھی گئی پہلی کتاب ابونصر سکونی اسماعیل بن مہران کی تالیف ہے۔ان کا تعلق دوسری صدی سے ہے۔ان کی کتاب کا نام "صفة المومن والفاجر" ہے جو اخلاق اسلامی کی پہلی کتاب کی حیثیت سے معروف ہے۔

(ج) اس کے بعد آیت اللہ صدر ان شخصیات کا ذکر کرتے ہیں جو اگر چہ کسی کتاب کے مولف تو نہ تھے مگر علم اخلاق کے بزرگان کی حیثیت سے معروف ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔سلمان فارسیؓ

جن کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ سلمان فارسی کی حیثیت حکیم لقمان جیسی ہے۔وہ اولین و آخرین کا علم رکھتے تھے۔وہ ایک وسیع سمندر تھے اور ہم اہل بیتؑ میں سے تھے۔[1]

۲۔ابوذر غفاریؓ

انہوں نے ساری عمر اخلاق اسلامی کی ترویج میں گزاری اور خود اخلاق اسلامی کا عمدہ نمونہ تھے۔اخلاقی مسائل میں حضرت عثمان اور امیر شام سے ان کے اختلافات تاریخ میں مشہور ہیں۔آخر کار انہوں نے اپنی جان بھی اسی راہ میں قربان کر دی۔

۳۔عمار یاسرؓ

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ان کے اور ان کے ساتھیوں کا ذکر کرتے ہوئے اور ان کے اخلاقی مقام و مرتبہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے تھے:

> ''کہاں ہیں میرے بھائی جو رہ راہِ حق کی طرف آئے اور اس پر ثابت قدم رہے؟ کہاں ہیں عمار؟''
> پھر آپ نے اپنا دست مبارک اپنی ریش مبارک پر رکھا اور طویل گریہ فرمایا۔پھر فرمایا:
> ''ہائے میرے وہ بھائی جو قرآن کی تلاوت کرتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے۔فرائض کو اہتمام سے ادا کرتے تھے۔سنتوں کو زندہ کرتے تھے اور بدعتوں کو مٹاتے تھے۔''[2]

---

[1] بحار الانوار۔22۔391

[2] نہج البلاغہ خطبہ 142

۴۔نوف بکالی

۹۰ ہجری کے بعد فوت ہوئے، وہ زہد وعبادت اور علم اخلاق میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔

۵۔محمد بن ابوبکر

حضرت علی علیہ السلام کے پیروکار تھے اور زہد وعبادت میں ان کے نقش قدم پر چلتے تھے۔روایات میں ان کا ذکر حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب خاص میں کیا گیا ہے۔اخلاق میں ان کی زندگی ایک نمونہ تھی۔

۶۔جارود ابن منذر

یہ حضرت امام زین العابدین، حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہم السلام کے اصحاب میں شامل اور بزرگ علماء میں سے تھے۔علم وعمل اور جامعیت میں اعلیٰ مقام پر تھے۔

۷۔حذیفہ بن منصور

یہ حضرت امام محمد باقر، حضرت امام جعفر صادق اور حضرت امام موسیٰ کاظم علیہم السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ان معصومینؑ سے علم حاصل کیا۔وہ مکارم اخلاق اور تہذیب نفس میں نابغہ روزگار تھے۔

۸۔عثمان بن سعید عمری

یہ امام زمان حضرت مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے وکلائے اربعہ میں سے تھے اور حضرت عمار یاسر کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ معارف واخلاق واحکام وفقہ میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

اس کے علاوہ بھی بہت سی بزرگ شخصیات ہیں جن کے اسمائے گرامی کے ذکر سے یہ بحث طولانی ہوجائے گی۔

اس ضمن میں اس بات کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ میں علم اخلاق پر بہت زیادہ کتب لکھی گئی ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل کے نام قابل ذکر ہیں:

۱۔ المانعات من دخول الجنة۔ یہ کتاب جعفر بن احمد قمی کی تالیف ہے جو تیسری صدی کے بزرگ علماء میں سے تھے۔

۲۔ الآداب اور مکارم الاخلاق۔ یہ کتاب علی بن احمد کوفی کی تالیف ہیں جو چوتھی صدی کے علماء میں سے تھے۔

۳۔ طهارت النفس یا تهذیب الاخلاق و تطهیر الاعراق۔ تالیف: ابن مسکویہ جو پانچویں صدی کے علماء میں سے تھے۔ان کی یہ کتاب علم اخلاق کی مشہور کتب میں سے ہے۔انہوں نے علم اخلاق میں ایک اور کتاب بھی لکھی ہے جس

کا نام ''آداب العرب والفرس'' ہے۔ یہ کتاب پہلی کتاب جیسی مشہور نہیں ہے۔

۴۔ تنبیه الخاطر و نزهة الناظر جو ''مجموعہ ورام'' کے نام سے مشہور اور علم اخلاق کی معروف کتب میں سے ہے۔ یہ کتاب ورام ابن ابی خوارس کی تالیف ہے جو چھٹی ہجری کے علماء میں سے تھے۔

۵۔ ساتویں صدی میں خواجہ نصیر الدین طوسی کی معروف کتب ''اخلاق ناصری''، ''اوصاف الاشراف'' اور "آداب المتعلمین" نظر آتی ہیں۔

ان میں سے ہر کتاب علم اخلاق کی کتب میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔

۶۔ دیگر صدیوں میں بھی "ارشاد القلوب"، تالیف: دیلمی، "مصابیح القلوب"، تالیف: سبزواری، "مکارم الاخلاق"، تالیف: حسن بن امین الدین، "الآداب الدینیه"، تالیف: امین الدین طبرسی، "محجة البیضاء" تالیف: فیض کاشانی جو کہ اس علم کی بہترین کتب میں سے ہے اور "جامع السعادات"، "معراج السعادة" اور "اخلاق بشر" اور دیگر بہت سی کتب تالیف ہوئیں۔[1]

مرحوم علامہ آقا بزرگ تہرانی نے اپنی کتاب ''الذریعہ'' میں علم اخلاق کی درجنوں کتب کا ذکر کیا ہے۔ یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ بہت سی کتب سیر وسلوک اور بعض کتب عرفان کی حیثیت سے شائع ہوئی ہیں۔ بعض کتب میں ایک یا چند ابواب کو علم اخلاق کے لیے مخصوص کر دیا گیا جس کا واضح ترین نمونہ بحار الانوار اور اصولِ کافی ہیں۔ ان کتب کے بہت سے حصے اخلاقیات سے متعلق ہیں اور اس علم کا بہترین سرمایہ شمار ہوتے ہیں۔

[1] تاسیس الشیعہ لعلوم الاسلامیہ کے آخری اب سے تلخیص وتصرف کے ساتھ۔

دوسرا باب

انسانی زندگی اور تمدن میں اخلاق کا کردار

بعض نا آگاہ افراد یہ سمجھتے ہیں کہ اخلاقی مسائل کا تعلق صرف انسان کی ذاتی زندگی سے ہے یا وہ انہیں ایسے مقدس، روحانی اور معنوی امور سے متعلق سمجھتے ہیں جن کا نتیجہ صرف آخرت میں ظاہر ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طرزِ تفکر ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ اکثر بلکہ سب اخلاقی مسائل انسان کی معاشرتی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، خواہ وہ اثرات مادی ہوں یا معنوی۔ اخلاق کے بغیر انسانی معاشرہ ایک ایسے چڑیا گھر میں تبدیل ہو جائے گا جس میں صرف پنجرے ہی ان انسان نما حیوانوں کی تخریبی کارروائیوں کا سد باب کر سکتے ہیں۔ اخلاق کے بغیر انسانوں کی طاقتیں ضائع اور ان کی صلاحیتیں کچلی جائیں گی۔ آزادی ہوس ران افراد کا کھلونا بن جائے گی اور انسانی زندگی اپنا حقیقی مفہوم کھو دے گی۔

اگر گزشتہ تاریخ میں صحیح غور و فکر کیا جائے تو بہت سی ایسی اقوام نظر آئیں گی جن میں سے ہر ایک کسی خاص اخلاقی انحراف کی وجہ سے یا تو زوال سے روبرو ہو گئیں یا پھر مکمل طور پر تباہ ہو گئیں۔

کئی حکمرانوں نے اپنی اخلاقی کمزوری کی وجہ سے اپنے ملک و ملت کو دردناک آلام و مصائب کے منہ میں دھکیل دیا۔ کئی فوجی کمانڈروں نے اپنی اخلاقی کمزوری کی وجہ سے اپنے سپاہیوں کی جان کو خطرے میں ڈالا اور اپنی خودسری کی وجہ سے انہیں ہلاکت سے دوچار کیا ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ انسانی زندگی اخلاق کے بغیر لطافت، شگوفائی اور حسن سے بے بہرہ ہوتی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اخلاق کے بغیر خاندانوں کی شیرازہ بندی بھی ممکن نہیں ہوتی۔ لیکن ان سب سے اہم بات یہ ہے کہ اخلاق کے بغیر انسان کی معاشرتی زندگی ایسے دردناک انجام سے دوچار ہو جاتی ہے جس سے برے انجام کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ اخلاقیات کے بغیر بھی انسانی معاشرہ کی خوش نصیبی صحیح قوانین اور احکام پر عمل کر کے حاصل کی جا سکتی ہے۔ ان کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ اخلاقیات کی مدد کے بغیر قوانین پر عمل کرنا بھی ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ جب تک لوگوں کے اندر احکام اور قوانین پر عمل کرنے کا جذبہ موجود نہ ہو، بیرونی کوششوں سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں کیا ہو سکتا۔ طاقت کے استعمال سے قوانین کا نفاذ، قوانین کے نفاذ کی بدترین صورت ہوتی ہے جسے انتہائی اضطرار کی صورت میں ہی اختیار کیا جانا چاہیے۔ اس کے برعکس ایمان اور اخلاق قوانین کے نفاذ کی بہترین ضمانت فراہم کرتے ہیں۔

اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ہم نمونہ کے طور پر بعض قرآنی آیات پر نظر ڈالتے ہیں جو ایک اہم مسئلہ کی طرف متوجہ کرتی ہیں:

۱۔ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴿۹۶﴾

''اگر بستیوں کے باشندے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم آسمان اور زمین سے ان پر برکتیں نازل کرتے لیکن انہوں نے تکذیب کی اور ہم نے ان کی کرتوتوں پر ان کو پکڑ لیا۔

(اعراف:۹۶)

۲۔ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۳۵﴾

''اور نیکی اور بدی ہرگز باہم برابر نہیں ہیں۔ بدی کو نیکی کے ذریعے دور کرو۔ اچانک تم دیکھو گے کہ جس شخص کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی، گویا وہ تمہارا مخلص دوست بن چکا ہے اور یہ بات انہیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے صابر ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے نصیب والا ہے۔

(فصلت:۳۴،۳۵)

۳۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴿۱۵۹﴾

''اللہ کی رحمت کی بدولت آپ ان کے لیے مہربان ہوگئے۔ اگر آپ سخت دل ہوتے تو یہ لوگ یقیناً آپ کے پاس سے دور ہو جاتے۔ پس آپ انہیں معاف کر دیں، ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں، امور میں ان سے مشورہ کریں، پھر جب آپ فیصلہ کر لیں تو اللہ پر توکل کریں۔ یقیناً اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔(آل عمران:۱۵۹)

۴۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ﴿۳۴﴾

''ہم نے جس بستی میں کوئی رسول بھیجا تو وہاں کے عیش پرستوں نے کہا کہ جو کچھ تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے، ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔(سبا:۳۴)

۵۔ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ ۡ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ

اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۷۷﴾ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۷۸﴾

''جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے، اس میں آخرت کا گھر تلاش کرو اور دنیا سے اپنے حصے کو فراموش نہ کرو۔ جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی اسی طرح احسان کرو اور زمین میں فساد نہ کرو کیونکہ اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (قارون نے) کہا: ''جو کچھ میرے پاس ہے، میں نے اسے اپنے علم کے ذریعے حاصل کیا ہے۔'' کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ نے اس سے پہلے ان لوگوں کو ہلاک کر دیا جو اس سے زیادہ طاقتور اور دولت مند تھے (اور جب اللہ کا عذاب آ جائے) تو مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔ (قصص: ۷۷، ۷۸)

۶۔ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ﴿۱۰﴾ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ﴿۱۱﴾ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ﴿۱۲﴾

''میں نے ان سے کہا تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، وہ بہت بخشنے والا ہے۔ وہ آسمان سے تم پر مسلسل برکت والی بارشیں بھیجتا ہے اور تمہارے اموال اور کثرت اولاد کے ذریعے تمہاری مدد کرتا ہے اور تمہارے لیے باغات اور نہریں بناتا ہے۔ (نوح: ۱۰ تا ۱۲)

۷۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾

''اگر یہ تورات، انجیل اور جو بھی ان کی طرف نازل کیا گیا، قائم کرتے تو اپنے اوپر سے اور اپنے پیروں کے نیچے سے کھاتے۔ ان میں سے کچھ لوگ میانہ رو ہیں جبکہ زیادہ تر بدعمل ہیں۔ (مائدہ: ۶۶)

۸۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

''جو کوئی عمل صالح انجام دے، خواہ مرد ہو یا عورت، ہم اسے پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ان کے بہترین اعمال کے حساب سے انہیں جزا دیں گے۔ (نحل: ۹۷)

۹۔ وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا وَّنَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى ﴿۱۲۴﴾

''اور جو میرے ذکر سے روگردانی کرے گا، اس کی زندگی اس پر تنگ ہو جائے گی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا محشور کریں گے۔(طٰہٰ: ۱۲۳)

۱۰۔ وَلَا تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا وَتَذۡهَبَ رِيۡحُكُمۡ

''جھگڑا نہ کرو، ورنہ تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔''(انفال:۴۶)

تشریح اور نتیجہ

مندرجہ بالا ان آیات میں سے پہلی آیت میں زمین و آسمان کی برکات اور تقویٰ کے باہمی تعلق کو واضح طور پر بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تقویٰ اور ایمان کی بدولت آسمان و زمین کی برکات انسان رواں ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس آیات الٰہی کی تکذیب اور تقویٰ سے دوری کی وجہ سے عذاب نازل ہوتا ہے:

وَلَوۡ اَنَّ اَهۡلَ الۡقُرٰٓى اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا لَفَتَحۡنَا عَلَيۡهِمۡ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ وَلٰكِنۡ كَذَّبُوۡا فَاَخَذۡنٰهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۹۶﴾

آسمان و زمین کی برکات کے معنی بہت وسیع ہیں۔ بارش کا برسنا، پودوں کا اگنا، نعمتوں کی فراوانی اور انسانی ذرائع میں اضافہ، سب اس میں آ جاتے ہیں۔

برکت اصل میں کسی چیز کے ثابت اور برقرار رہنے کو کہتے ہیں۔ اس کا اطلاق ہر پائیدار نعمت پر کیا جاتا ہے۔ بنابراین بے برکت چیزیں وہ ہوتی ہیں جنہیں ثبات و قرار حاصل نہ ہو اور وہ جلد فنا ہو جاتی ہوں۔

بہت سی اقوام جو بہت زیادہ مادی وسائل، قدرتی ذرائع، صنعتی پیش رفت اور ترقی میں بہت آگے ہیں، اخلاقی انحطاط اور بد عملی کے نتیجہ میں ان نعمتوں کی برکتوں سے محروم ہو جاتی ہیں اور یہی نعمتیں ان کی تباہی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے قرآنی آیات میں ایسے لوگوں کا ذکر پایا جاتا ہے جن کی نعمتیں ان کی تباہی اور بدبختی کا سبب بن گئیں۔ مثلاً سورۂ توبہ کی آیت ۸۵ میں ہے:

وَلَا تُعۡجِبۡكَ اَمۡوَالُهُمۡ وَاَوۡلَادُهُمۡ ؕ اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّعَذِّبَهُمۡ بِهَا فِى الدُّنۡيَا وَتَزۡهَقَ اَنۡفُسُهُمۡ وَهُمۡ كٰفِرُوۡنَ ﴿۸۵﴾

یعنی ''ان کے اموال اور اولاد تمہارے لیے باعث تعجب نہ ہونے چاہئیں۔ اللہ چاہتا ہے کہ دنیا میں انہیں ان کے ذریعے سزا دے اور ان کی جان اس طرح نکلے کہ وہ کافر ہوں۔''

اس بات میں ذرا بھی شک نہیں کہ جب نعمتیں اور اخلاقی انحطاط یکجا ہو جائیں تو یہ دنیا میں بھی باعث عذاب ہے اور اخروی

زیان اور خسارے کا بھی سبب ہے۔

بالفاظ دیگر جب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور ایمان، اخلاق اور انسانی اصول ایک ساتھ ہوں تو یہ آبادی، ترقی، فلاح و بہبود اور سعادت وخوش نصیبی کا سبب ہوتی ہیں۔ زیر بحث آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس جب نعمتیں اور اخلاقی انحطاط، بخل، ظلم، خودسری وہوس رانی ایک ساتھ ہو جائیں تو اس کا نتیجہ تباہی وفساد ہوتا ہے۔

دوسری آیت میں کینہ ونفرت اور دشمنی کو ختم کرنے کا بہت موثر اور اہم طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت میں دشمنی کو ختم کرنے کے سلسلہ میں اخلاق کے تعامل کو واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۴﴾

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ ایسا کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہر کسی میں یہ بزرگی اور وسیع القلبی نہیں پائی جاتی بلکہ صرف وہی لوگ اس مقام پر پہنچتے ہیں جو صبر واستقامت رکھتے ہیں اور اس اخلاقی فضیلت کو صرف وہی پا سکتے ہیں جنہیں ایمان وتقویٰ سے بڑا حصہ ملا ہو:

وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ﴿۳۵﴾

نفرت اور کینہ آہستہ آہستہ جمع ہوتے رہتے ہیں اور ایک پہاڑ بن جاتے ہیں جو ہمیشہ انسانی معاشروں کی ایک بڑی مشکل رہی ہے۔ تمام جنگوں کے پیچھے یہی خرابی کارفرما ہے جو ہر چیز کو نگل لیتی ہے اور ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

اگر اس آیت میں بیان کردہ طریقہ، یعنی بدی کا مقابلہ نیکی سے، اختیار کیا جائے تو سب کینے اور نفرتیں اس طرح زائل ہو جائیں گے جیسے گرمیوں کی دھوپ میں برف پگھل جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی معاشرہ بہت سی خطرناک جنگوں سے محفوظ ہو جائے گا۔ جرائم کم ہو جائیں گے اور تعاون ودوستی کی راہیں کھل جائیں گی۔

لیکن جیسا کہ خود قرآن مجید نے فرمایا ہے کہ یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے اور اس مقام پر پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان نے ایمان وتقویٰ اور اخلاقی تربیت سے بہت زیادہ حصہ پایا ہو۔

ظاہر سی بات ہے کہ اگر آپ سختی کا جواب سختی سے دیں اور بدی کے جواب میں بدی سے پیش آئیں تو برائی میں اضافہ ہوتا جائے گا اور روز بروز ان کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا جائے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی معاشرہ وسیع سطح پر بدقسمتی کا شکار ہو جائے گا۔

لیکن بدی کا نیکی سے مقابلہ کرنے کی بھی کچھ حدود وشرائط ہیں جن کو مناسب مقام پر بیان کیا جائے گا۔

تیسری آیت لوگوں کو جذب کرنے میں حسن اخلاق کی تاثیر کو بیان کر رہی ہے اور اس حقیقت کی نشاندہی کر رہی ہے کہ اگر کوئی سربراہ اخلاق الٰہی سے آراستہ ہو تو اسے اپنے امور کی انجام دہی میں کتنی کامیابی حاصل ہوتی ہے اور کس طرح بکھرے ہوئے دلوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے معاشرے کی پیش رفت اور ترقی کی راہیں کھولتا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝۱۵۹

''اللہ کی رحمت کی بدولت آپ ان پر نرم اور مہربان ہو گئے۔ اگر آپ سخت مزاج اور سنگدل ہوتے تو یہ آپ کے اردگرد سے بکھر جاتے۔ آپ انہیں معاف کیجیے۔ ان کے لیے استغفار کیجیے۔ اپنے معاملات میں ان سے مشورہ کیجیے۔ پھر جب آپ کوئی فیصلہ کریں تو اس پر ثابت قدم رہئے اور اللہ پر توکل کیجیے کیونکہ اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

یہ آیت انتظامی امور میں کامیابی، دلوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے اور معاشرے میں اتحاد پیدا کرنے میں حسن اخلاق کی گہری تاثیر کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ حسن اخلاق کی یہ تاثیر صرف الٰہی اور معنوی امور میں محدود نہیں ہے بلکہ انسان کی مادی زندگی پر بھی گہرا اثر ڈالتی ہے۔

اس آیت کے ذیل میں تین چیزوں کا حکم دیا گیا ہے:

عفوودرگزر۔ استغفار۔ مشورہ۔

یہ تینوں بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، اس لیے کہ جو اخلاقی کیفیت مہربانی اور تواضع کی بنیاد پر ہوتی ہے، وہ لوگوں کی خطاؤں سے چشم پوشی، استغفار اور غلطیوں کی تلافی کا سبب بنتی ہے اور لوگوں کے انسانی احترام کا باعث ہوتی ہے۔

چوتھی آیت بداخلاقی کے بعض منفی اثرات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ہمیشہ عیش پرست افراد نے انبیاء کے خلاف صف آرائی کی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا سراپا تکبر اور خود پسندی سے بھرا ہوا تھا۔ آیت یہ کہتی ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝۳۴

''ہم نے جس بستی میں کوئی رسول بھیجا تو وہاں کے عیش پرستوں نے کہا کہ جو کچھ تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے، ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔''

قرآن شریف ان کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے کہ یہ اس قدر مغرور تھے کہ کہتے تھے کہ:

وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝۳۵

''اور ہم مال واولاد میں تم سے زیادہ ہیں اور ہمیں ہرگز سزا نہیں دی جائے گی۔''

یہ اخلاقی کیفیت معاشرے میں اصلاح کے لیے کی جانے والی ہر کوشش کے خلاف صف آرائی کا سبب بنتی ہے۔ ایسے لوگ اہل حق کو قتل کر دیتے ہیں، حق پرستوں کی آواز کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور معاشرے میں ظلم اور بدعنوانی کے بیج پھیلاتے

ہیں۔ یہاں سے انسانی معاشرے پر اخلاقی انحطاط کے منفی اثرات ظاہر ہوجاتے ہیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ناز ونعمت کی بنیاد پر وجود میں آنے والے تکبر کی وجہ سے یہ افراد فکری لحاظ سے بھی واضح اور بھیانک غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ نعمتوں کی فراوانی سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ وہ بارگاہِ الٰہی میں بہت پسندیدہ ہیں کیونکہ اگر وہ مقرب بارگاہِ الٰہی نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ انہیں یہ نعمتیں عطا نہ فرماتا۔ اس طرح یہ افراد ہر قسم کی اخلاقی اقدار کا انکار کر دیتے تھے۔ قرآن شریف اگلی آیت میں اس طرزِ تفکر کی غلطی کو نمایاں کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں معیار قرب صرف ایمان اور عمل صالح ہے۔

صرف قریش کے ثروت مند مشرکین ہی نہیں بلکہ ناز ونعمت کے پروردہ سارے متکبر، انبیاء اور مصلحین کے سامنے اسی مؤقف کو اختیار کرتے رہے۔

پانچویں آیت میں اسی مسئلہ کا ایک اور رخ دکھایا گیا ہے۔ یہ آیت بنی اسرائیل کے مغرور اور متکبر دولتمند قارون کا حال بیان کررہی ہے۔

جب بنی اسرائیل کے اہل علم ودانش نے اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ اپنے مال و دولت کو اپنی اور اپنے معاشرے کی سعادت کے لیے کام میں لاؤ اور جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی اللہ کے بندوں کے ساتھ احسان سے پیش آؤ اور ظلم وفساد کی راہ پر نہ چلو کیونکہ اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا:

وَابْتَغِ فِيمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ۝۷۷

اس نے مخصوص غرور اور تکبر کے ساتھ جواب دیا:

''میں نے یہ ساری دولت اپنے علم اور اپنی قابلیت سے حاصل کی ہے۔''

یعنی یہ نہ کہو کہ یہ دولت اللہ نے مجھے دی ہے بلکہ یہ کہو کہ میرے علم اور میری قابلیت کے نتیجہ میں یہ دولت مجھے حاصل ہوئی ہے۔ آخر کار اسی تکبر اور غرور نے اسے انکارِ آیاتِ الٰہی کی ہولناک کھائیوں میں گرادیا اور وہ ظلم وفساد اور دشمنانِ حق وعدالت کے ساتھ دوستی اور تعاون میں مشغول ہوگیا۔ پھر ایک حادثہ میں اپنے تمام اموال سمیت زمین میں دھنس گیا۔

یہاں ایک بار پھر یہی حقیقت واضح ہوکر نظر آتی ہے کہ رذائل اخلاقی کس حد تک انسان اور معاشرے کے چہرے کو تبدیل کردیتے ہیں اور انہیں سعادت اور خوش نصیبی تک پہنچنے سے روک دیتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ دوران گفتگو بنی اسرائیل کے اہل علم ودانش نے اس سے کہا:

''خوش نہ ہو، اللہ خوش ہونے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔''

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ۝۷۶

یہ بات واضح رہے کہ اسلام اور عقل کی رو سے خوش رہنا اور خوشی و مسرت کی زندگی گزارنا برا عمل نہیں ہے۔ یہاں خوشی و مسرت سے مراد غرور و تکبر، اللہ تعالیٰ سے غفلت اور ظلم و بدعنوانی و گناہ سے حاصل ہونے والی خوشی و مسرت ہے جو مزید سرکشی اور فساد کا سبب بنتی ہے۔

چھٹی آیت میں ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی شکایت کو دیکھتے ہیں۔ اس میں ہمیں اس حقیقت کی طرف متعدد اشارے ملتی ہیں کہ انسان کے اعمال اور اس کی اخلاقی صفات انسان کی ذاتی اور اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں:

''یا اللہ! میں نے اپنی قوم سے کہا کہ اپنے رب کے حضور استغفار کرو (غرور و نخوت کی سواری سے نیچے اتر آؤ، اپنے گناہوں، کفر و عناد اور ہٹ دھرمی سے توبہ کرو) اس لیے کہ وہ بڑا بخشنے والا ہے تاکہ وہ آسمان سے مسلسل بابرکت بارش نازل کرتا رہے اور تمہیں اموال و اولاد کی کثرت سے نوازے اور تمہیں باغات اور نہریں عطا کرے۔''

آگے چل کر انہی آیات میں اللہ کے احکام کے سامنے ان کی سرکشی اور ان کی ان بری خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے جو ان کے گناہوں کی بنیادی وجہ تھیں۔

ممکن ہے کوئی یہ کہہ دے کہ مندرجہ بالا آیت توبہ و استغفار اور نعمتوں کی فراوانی کے درمیان ایک معنوی تعلق کو بیان کر رہی ہے۔ اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ یہ بات صحیح ہے لیکن اس کے باوجود یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں معنوی تعلق کے ساتھ ساتھ ظاہری تعلق بھی مراد ہو۔ لہٰذا قرآن مجید میں ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ

''جو کچھ لوگوں نے کیا، اس کی وجہ سے زمین اور سمندر میں فساد ظاہر ہوا۔'' (روم: ۴۱)

سورۂ ہود میں یہی بات ایک اور انداز میں کہی گئی ہے جہاں رسولؐ اللہ مشرکین مکہ سے فرماتے ہیں:

أَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى

''میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ تم اپنے رب کی خدمت میں استغفار کرو، پھر اس کے حضور میں توبہ کرو، وہ ایک مقررہ مدت تک تمہیں اچھی نعمتوں سے بہرہ مند فرمائے گا۔'' (ہود: ۳)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مقررہ مدت تک ''متاع حسن'' سے بہرہ مند فرمانا دنیوی زندگی کی مادی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جس کا دار و مدار گناہوں سے توبہ، استغفار اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کی طرف رجوع کرنے اور اچھی اخلاقی صفات اپنانے پر ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صفات رذیلہ مختلف قسم کے گناہوں کا سرچشمہ ہوتے ہیں جبکہ گناہ معاشرے میں مختلف قسم کی

خرابیوں اور تعلقات کے ٹوٹنے، اتحاد، دوستی، محبت اور اعتماد کے خاتمہ کا سبب بنتے ہیں۔ ان سب باتوں کا نتیجہ معاشرتی بگاڑ، اقتصادی بدحالی اور امن وامان کے برباد ہونے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ساتویں آیت میں اہل کتاب کی سرکشی اور طغیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝۶۶

''اگر اہل کتاب تورات وانجیل کو اور جو کچھ ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل ہوا، قائم کرتے (اور تقویٰ اختیار کرتے اور عمل صالح انجام دیتے) تو آسمان اور زمین سے رزق حاصل کرتے۔ (لیکن) ان میں سے بہت کم اعتدال کی راہ پر ہیں جبکہ ان کی اکثریت کے اعمال برے ہیں۔''

اس آیت میں بھی ہم اعمالِ صالح اور تقویٰ اور زمین وسمان سے برکتوں کے نزول کے درمیان قریبی تعلق کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ تعلق روحانی بھی ہوسکتا ہے اور طبیعی بھی، بلکہ حقیقت میں یہ دونوں تعلق پائے جاتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ فیض الٰہی محدود نہیں ہے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ اس سرچشمۂ فیض سے مستفیض ہونے کی صلاحیت اور قابلیت پیدا کریں۔ لیکن راہِ اعتدال سے انحراف نے، خواہ افراط کی صورت میں ہو یا تفریط کی شکل میں، انسانی زندگی کو اندھیروں سے بھر دیا ہے اور آرام وسکون کی بساط لپیٹ دی ہے۔ ویران کن جنگیں انسانی جانوں اور معنوی ومادی سرمائے کو چاٹ جاتی ہیں اور انسانوں کی کئی برس کی محنت کو تباہ وبرباد کر دیتی ہیں۔

اس آیت کا یہ جملہ ''وما انزل الیھم'' سب آسمانی کتاب، حتی کہ قرآن مجید کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس لیے کہ سب آسمانی کتابوں کی بنیادی تعلیمات ایک ہی ہیں۔ اگرچہ اسلامی وقرآنی تعلیمات گزشتہ کتب کی نسبت زیادہ کامل اور جامع ہیں۔

آٹھویں آیت میں ہم ایک نئی تعبیر کا سامنا کرتے ہیں۔ یہ آیت حیات طیبہ یعنی پاکیزہ زندگی اور اعمال صالح (اور جو صفات اعمال صالح کا سرچشمہ ہیں) کے درمیان موجود تعلق کو بیان کرتی ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹۷

''جو کوئی عمل صالح انجام دے، خواہ مرد ہو یا عورت اور مومن بھی ہو تو ہم انہیں پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ان کے بہترین اعمال کے مطابق انہیں جزا دیں گے۔''

گزشتہ آیات میں زیادہ تر اخلاق اور معاشرتی زندگی کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی گئی لیکن زیر بحث آیت میں زیادہ تر ذاتی

زندگی کو مدنظر رکھا گیا ہے۔لہٰذا ارشاد فرمایا کہ جو انسان خواہ مرد ہو یا عورت، اگر ایمان اور عمل صالح سے آراستہ ہے تو اسے حیات طیبہ نصیب ہوگی۔اس آیت میں کوئی ایسا اشارہ موجود نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ حیات طیبہ صرف آخرت میں محدود ہے بلکہ زیادہ تر دنیوی زندگی یا دنیوی اور اخروی دونوں قسم کی زندگی پیش نظر ہے۔

حیات طیبہ کیا ہے؟ مفسرین نے حیات طیبہ کی متعدد تشریحات بیان کی ہیں۔بعض نے اس سے رزق حلال مراد لیا ہے۔ بعض نے قناعت اور اللہ کی عطا پر راضی رہنا مراد لیا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد رزق حلال اور توفیق عبادت ہے۔بعض نے کہا ہے کہ اس سے ہر قسم کی پاکیزگی اور ہر قسم کی آلودگی، ظلم وخیانت، عداوت وغیرہ سے دوری اور ہر قسم کی پاکیزگی مراد ہے۔لیکن "**ولنجزینھم اجرھم**" جو کہ اخروی اجر کو بیان کر رہا ہے، سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیات طیبہ کا اشارہ زیادہ تر اس دنیا میں پاکیزہ زندگی کی طرف ہے۔

نویں آیت میں اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت اور روگردانی کو ''معیشت ضنک'' (تنگ اور سخت زندگی) کا سبب قرار دیا گیا ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾

''جو بھی میری یاد سے روگردانی کرے گا، اس کی زندگی تنگ اور سخت ہوگی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا محشور کریں گے۔''

ہم اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے اسماء وصفات کی طرف توجہ تمام اخلاقی فضائل کی پرورش کا سبب ہے اور انسان کو روز بروز اخلاق وصفات کے حوالہ سے اسماء وصفات الٰہی کے قریب کرتی ہے۔یہ اخلاقی خصوصیات جو انسان کے اعمال صالح کا اصل سرچشمہ ہیں، اس کی زندگی کو وسیع، آسان اور پاکیزہ بنا دیتی ہیں۔

اس کے برعکس اللہ کی یاد سے روگردانی انسان کو اس سرچشمۂ نور سے دور کر کے اسے تاریک شیطانی صفات کے قریب کر دیتی ہے جو معیشت ضنک یعنی تنگ زندگی کا سبب ہو جاتی ہیں اور وہ ایک مرگبار زندگی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔اس طرح یہ آیت بھی بہت وضاحت کے ساتھ اخلاق وایمان اور انفرادی واجتماعی زندگی کے باہمی تعلق کو بیان کر رہی ہے۔

بعض مفسرین اور اہل لغت نے ''معیشت ضنک'' کی تشریح کرتے ہوئے اسے رزق حرام سے بسر ہونے والی زندگی قرار دیا کیونکہ ایسی زندگی بہت سی پریشانیوں کا سبب بنتی ہے۔بعض دیگر مفسرین کا کہنا ہے کہ ایمان سے محروم افراد عام طور پر بہت حریص ہوتے ہیں۔مادی خواہشات کی شدت اور نہ ختم ہونے والی پیاس، مادی نعمتوں کے ضائع ہو جانے کا خوف، بخل اور دیگر مذموم صفات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام مادی وسائل کے باوجود انسان کی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔

قیامت کے دن ان لوگوں کا اندھا پن بھی درحقیقت دنیا میں ان کے اندھے پن کا تجسم ہوگا کیونکہ انہوں نے دنیا میں اپنی آنکھیں بند کیے رکھیں اور حق وسعادت کی راہ کو نہیں دیکھا اور شہوت کی تاریکیوں میں ڈوب گئے۔

اس نکتہ کی مزید تشریح کتاب کے اس حصہ کے آخر میں بیان ہوگی۔

دسویں آیت میں دشمنی اور اختلافات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو کہ وحدت کے خاتمہ اور قوت و طاقت کے گھٹنے کا سبب ہوتے ہیں:

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ

''آپس میں اختلاف نہ کرو کیونکہ اس سے تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔''

ظاہر سی بات ہے کہ تمام اختلافات اور ہر کشمکش صفات رذیلہ کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔ ہر چیز پر اپنی حاکمیت کی خواہش کرنا، خود پسندی، مفاد پرستی، احساس برتری، حرص و کینہ و حسد جیسی صفات میں سے ہر ایک اختلاف اور دشمنی کا سبب ہو سکتی ہے جس کا نتیجہ کمزوری اور عزت و شوکت کے خاتمہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قرآن شریف نے "تذهب ریحکم" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ''ریح'' کے معنی اصل میں ''ہوا'' کے ہیں اور بطور کنایہ طاقت، قوت اور غلبہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جب ہوا چلتی ہے تو پرچم، جو کسی قوم کی طاقت، قوت اور غلبہ کی علامت ہوتا ہے، لہرانے لگتا ہے۔ اس لحاظ سے اس جملہ کے معنی یہ ہوں گے کہ:

''اگر تم اختلاف کرو گے تو تمہاری طاقت، قوت اور غلبہ کا خاتمہ ہو جائے گا۔''

یا اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ''ہوا کے چلنے کے نتیجہ میں کشتی کی رفتار زیادہ ہو جاتی ہے اور وہ جلدی منزل پر پہنچ جاتی ہے۔''

لغت کی معروف کتاب ''التحقیق'' کے مؤلف فرماتے ہیں کہ روح اور ریح کے معنی میں ایک تعلق پایا جاتا ہے۔ روح غیر مادی دنیا میں روحانی حرکت کے معنی دیتی ہے جبکہ ریح مادی دنیا میں حرکت کے معنی رکھتی ہے۔

بعض اوقات ریح کا لفظ خوشبو کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں آیا ہے:

اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ

''میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔'' (یوسف: ۹۴)

اس لحاظ سے ممکن ہے اس جملہ کے معنی یہ ہوں کہ طاقتور افراد یا اقوام کی خوشبو ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے لیکن اگر ان میں اختلاف پیدا ہو جائے تو ان کا اثر و رسوخ ختم ہو جاتا ہے۔

بہر حال اختلاف کی وجہ خواہ خود پسندی، مفاد پرستی، حسد، بخل ہو یا کچھ اور، انسانی زندگی پر اس کے منفی اثر اور معاشرتی پسماندگی میں اس کے کردار کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں سے اخلاقی مسائل اور معاشرتی زندگی کے مسائل کا باہمی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

نتیجہ

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کی ہر اخلاقی صفت، معنوی اور اخروی پہلو کے علاوہ مادی اور دنیوی زندگی سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ تصور کرنا ہرگز درست نہیں ہے کہ اخلاقی مسائل کا تعلق انسان کی ذاتی اور انفرادی زندگی تک محدود ہے اور یہ معاشرتی زندگی سے الگ تھلگ کوئی چیز ہے، بلکہ اس کے برعکس، ان کا قریبی اور قوی تعلق ہے۔ کسی بھی قسم کی معاشرتی تبدیلی اخلاقی تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

بالفاظ دیگر اگر کسی بڑے معاشرے کے لوگ سعادت مندانہ اور صلح و امن پر مبنی تعاون و رواداری کی زندگی بسر کرنے کے خواہش مند ہوں تو کم از کم اتنی اخلاقی پختگی ان میں ضرور ہونی چاہیے کہ انسانوں کے فکری، روحی اور جذباتی اختلافات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس لیے کہ سب انسان مختلف پہلوؤں میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ امید ہرگز نہیں کرنی چاہیے کہ سب لوگ ہر چیز میں ہماری پیروی کریں، بلکہ مشترکہ اصولوں کی حفاظت کی کوشش کرنی چاہیے اور فکر و عمل کے اختلافات کو بالغ نظر یا وسیع القلبی، نرمی اور بردباری سے برداشت کرنا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر دو افراد بھی طویل المدت تعاون جاری نہ رکھ سکیں گے۔

ظاہر سی بات ہے کہ اختلاف کو برداشت کرنے کی اخلاقی جرأت جو اتحاد، قدرت اور عظمت کے حصول کے لیے ضروری ہے، صرف باتوں سے پیدا نہیں ہوسکتی، اس کے لیے کافی زیادہ تزکیہ نفس اور تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔

احادیث کی روشنی میں مادی زندگی اور اخلاق کا باہمی تعلق

گزشتہ صفحات میں جن باتوں کا ہم نے قرآنی آیات کی روشنی میں جائزہ لیا ہے، وہ احادیث میں بھی وسیع پیمانہ پر نظر آتی ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی صفات انسان کی ذاتی اور معاشرتی زندگی پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ ہم یہاں پر چند احادیث کو نقل کرتے ہیں:

۱۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

فی سعة الاخلاق کنوز الارزاق

''رزق کے خزانے اخلاق کی وسعت میں پائے جاتے ہیں۔'' (بحار الانوار، ۷۵: ۵۳)

۲۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

حسن الخلق یزید فی الرزق

''حسن اخلاق رزق میں اضافہ کرتا ہے۔'' (بحار الانوار، ۶۸: ۳۹۶)

۳۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

من حسن خلقه كثر محبوه و آنست النفوس به (غرر الحکم)

''جس کا اخلاق اچھا ہو، اس کے چاہنے والے زیادہ ہوتے ہیں اور دل اس سے مانوس ہوتے ہیں۔''

۴۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان البر و حسن الخلق يعمر ان الديار و يزيدان فی الاعمار

''نیکی اور حسن اخلاق شہروں کو آباد اور عمروں کو زیادہ کرتے ہیں۔'' (بحار الانوار، ۶۸: ۳۹۵)

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ شہروں کی آبادی اتحاد، اخلاص اور تعاون کی مرہون منت ہے۔ جو چیزیں ان اقدار کو پختہ کرنے میں موثر ہوتی ہیں، وہ شہروں کو آباد رکھنے میں بھی اتنی ہی موثر ہوتی ہیں۔

طویل عمری بھی آرام وسکون، فکری آسودگی، غربت کی روک تھام اور معاشرتی تعاون کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں بھی حسن اخلاق کی بدولت ہی حاصل ہوسکتی ہیں۔

۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

حسن الخلق يثبت المودة

''حسن اخلاق سے محبت میں ثبات پیدا ہوتا ہے۔'' (بحار الانوار، ۷۴: ۱۴۸)

متعدد احادیث میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ بداخلاقی معاشرے میں نفرت، اختلاف، رزق کی تنگی اور بے سکونی کا باعث بنتی ہے۔

۶۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

من ساء خلقه ضاق رزقه

''بداخلاق کی روزی تنگ ہوجاتی ہے۔'' (غرر الحکم)

۷۔ حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

من ساء خلقه اعوزه الصديق و الرفيق

''بداخلاق کے دوست اسے چھوڑ جاتے ہیں۔'' (غرر الحکم)

۸۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

سوء الخلق نكد انكم العيش و عذاب النفس

''بداخلاقی زندگی میں گھٹن اور روحی عذاب کا باعث ہوتی ہے۔'' (غرر الحکم)

۹۔ حضرت علی علیہ السلام سے پوچھا گیا:

من ادوم الناس غما

''کون سب سے زیادہ غمگین ہوتا ہے؟''

آپؑ نے فرمایا:

اسوئھم خلقا

''جو سب سے زیادہ بداخلاق ہوتا ہے۔'' (مستدرک الوسائل، ۹:۸ ۳۳)

۱۰۔ ایک حدیث میں ہے کہ لقمان حکیم اپنے بیٹے کو اس طرح نصیحت کرتے تھے:

ایاك والضجر و سوء الخلق وقلة الصبر فلا یستقیم علی ھذہ الخصال صاحب

''بے حوصلگی، بداخلاقی اور کم صبری سے پرہیز کر کیونکہ ان صفات کے مالک کا کوئی دوست باقی نہیں رہتا۔'' (بحار الانوار، ۱۰:۴۱۹)

تیسرا باب

اخلاقی مکاتب فکر

علم اخلاق میں بہت سے مکاتب فکر ہیں جن میں سے زیادہ تر گمراہ ہیں اور ان کا نتیجہ بھی خلافِ اخلاق ہوتا ہے۔قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ان مکاتب فکر کی شناخت مشکل نہیں ہے۔قرآن شریف فرماتا ہے:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴿۱۵۳﴾

''یہی میرا سیدھا راستہ ہے،لہٰذا اسی کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو، وہ تمہیں اس راہ سے الگ کر کے متفرق کر دیں گے۔اللہ نے تمہیں یہ نصیحت کی ہے تا کہ تم متقی بن جاؤ۔''(انعام:۱۵۴)

یہ آیت اسلامی عقائد اور عملی و اخلاقی تعلیمات کے ایک بڑے حصے کے بیان کے بعد آئی ہے اور دس اسلامی احکام پر مشتمل ہے۔سب انفرادی اور اجتماعی نظام ہائے زندگی کی طرح اخلاقی مکاتب فکر بھی ''نظریۂ کائنات'' اور کائنات کے متعلق کلی اور عمومی نظریات سے جنم لیتے ہیں۔یہ دونوں ایک اکائی کی طرح باہم جڑے ہوئے ہیں۔

جو لوگ نظریۂ کائنات کو آئیڈیالوجی سے الگ سمجھتے ہیں اور ان کے باہمی تعلق کا انکار کرتے ہیں،ان کا استدلال یہ ہے کہ نظریۂ کائنات منطق اور سائنسی دلائل پر قائم ہوتا ہے جبکہ آئیڈیالوجی یعنی ''یہ ہونا چاہیئے'' اور ''یہ نہیں ہونا چاہیئے'' احکام ہیں۔یہ طرزِ فکر رکھنے والے افراد اس اہم نکتہ سے غفلت کر گئے ہیں یہ احکام اسی صورت میں صحیح اور حکیمانہ ہو سکتے ہیں جب کائنات کے حقائق کے ساتھ ہم آہنگ ہوں۔ورنہ یہ نا قابل قبول فرضی باتیں متصور ہوں گی۔

اس بات کو کئی مثالوں کے ذریعے واضح کیا جا سکتا ہے،مثلاً جب اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ شراب خوری نہ کرو یا بین الاقوامی قوانین یہ کہتے ہیں کہ منشیات کا استعمال ممنوع ہے تو یہ احکام،خواہ الٰہی ہوں یا انسانی،یقیناً کچھ حقائق کی بنیاد پر بنتے ہیں۔وہ حقیقت یہ ہے کہ شراب اور منشیات کا استعمال انسان کی روح اور جسم پر بہت منفی اور تباہ کن اثرات مرتب کرتا ہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ اسلامی احکام مصلحت پر مبنی ہیں تو اس کے معنی بھی یہی ہوتے ہیں۔جب ہم کہتے ہیں،

کلما حکم به العقل حکم به الشرع

''ہر وہ حکم جو عقل دیتی ہے،شریعت بھی وہی حکم دیتی ہے۔''

تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ احکام اور حقائق کے درمیان قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔

انسانی معاشروں کے قانون ساز اداروں میں جب ماہرین انفرادی واجتماعی مسائل پر بحث کر کے قانون سازی کرتے ہیں تو وہ بھی اسی حقیقت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ بات ناممکن ہے کہ کوئی حکیمانہ حکم انسانی زندگی کے حقائق سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ حکم، حکم اور قانون نہیں بلکہ بیہودگی اور دھونس کہلائے گا۔ چونکہ حقیقت ایک ہی ہے، لہٰذا کسی چیز کے بارے میں صحیح حکم بھی ایک ہی ہوسکتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم حقائق اور ان کی بنیاد پر قائم قوانین کو جاننے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔

اس گفتگو سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کائنات اور انسان کے بارے میں نظریات کا اخلاقی مسائل کے ساتھ گہرا تعلق پایا جاتا ہے اور مختلف اخلاقی مکاتب فکر کی پیدائش اور ان کے اختلاف کی وجہ بھی یہی ہے۔ ان حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے اب ہم اخلاقی مکاتب فکر پر نظر ڈالتے ہیں۔

۱۔ اخلاق اور مکتب توحید

اس مکتبہ فکر کی بنیاد پر تمام موجودات مخلوق خدا ہیں۔ ہم سب اسی کی طرف سے ہیں اور ہم سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ انسان کی خلقت کا مقصد معنوی اور روحانی کمال حاصل کرنا ہے۔ مادی ترقی جہاں تک اس ہدف کے حصول کی راہ ہموار کرے، وہ بھی معنوی ترقی ہی محسوب ہوگی۔

معنوی وروحانی ترقی یا تکامل کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا اور ایسی راہ پر چلنا ہے جو انسان کو اس کی صفات کمال سے نزدیک کردے۔

اس مکتب کی رو سے وہ تمام صفات افعالی جو انسان کو اس راہ پر چلنے کے لیے آمادہ کریں، معیارِ اخلاق قرار پاتی ہیں۔ اس مکتب کے نظام اقدار کا مرکز ومحور بھی اعلیٰ انسانی صفات، معنوی کمال اور قرب خدا ہے۔

۲۔ اخلاق اور مادیت

ہم جانتے ہیں کہ مادہ پرستی کے کئی شعبے ہیں جن میں کمیونسٹ مکتب فکر زیادہ مشہور ہے۔ یہ مکتب فکر ہر چیز کو مادی نظر سے دیکھتا ہے اور خدا اور معنوی کمال پر ایمان نہیں رکھتا۔ یہ مکتب فکر اقتصاد کو ہی ہر چیز کی بنیاد قرار دیتا ہے اور تاریخ کے لیے بھی مادی اور اقتصادی ماہیت کا قائل ہے۔ اس مکتب فکر کی رو سے ہر وہ چیز جو کمیونسٹ اقتصادی نظام سے نزدیک کرے، عین اخلاق ہے۔ ان کے اپنے الفاظ میں:

''ہر وہ چیز جو کمیونسٹ انقلاب کی رفتار کو تیز کردے، وہ اخلاق ہے۔''

مثلاً جھوٹ یا سچ کے اخلاقی یا غیر اخلاقی ہونے کا فیصلہ اس بات سے ہوگا کہ ان میں کون سی چیز انقلاب کی رفتار تیز کرتی

ہے۔اگر جھوٹ انقلاب کی رفتار کو تیز کر رہا ہو وہ اخلاقی ہے اور اگر سچ انقلاب پر منفی اثر ڈالے تو وہ غیر اخلاقی ہے۔

مادہ پرستی کے دوسرے شعبے بھی اپنے اپنے نکتہ نظر کے مطابق اخلاق کی تشریح کرتے ہیں۔جو مادی لذتوں کو ہی زندگی کا مقصد قرار دیتے ہیں،ان کے نزدیک اخلاق نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔بہ عبارت دیگر ان کے نزدیک ہر وہ صفت یا فعل جو حصولِ لذت کی راہ ہموار کرے،عین اخلاق ہے۔

جو مادہ پرست ذاتی مفاد کو ہر چیز کی بنیاد قرار دیتے ہیں،ہر چیز کو حتی کہ انسانی معاشرے کو بھی اس حد تک محترم سمجھتے ہیں جب تک ان کے ذاتی مفادات کی تکمیل ہو رہی ہو۔(مغرب کے سرمایہ دارانہ معاشرے اسی کا نمونہ ہیں)۔ان کے یہاں وہی چیز اخلاقی ہے جو ان کے ذاتی مفادات کے حصول میں معاون ثابت ہو۔یہ ہر چیز کو ذاتی مفاد پر قربان کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔

۳۔اخلاق اور عقلی فلسفہ

وہ فلاسفہ جو عقل کو بنیادی حقیقت قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ فلسفہ کا مقصد یہ ہے کہ بیرونی دنیا کی مانند انسان کے اندر ایک عقلی دنیا آباد کرے،ان کے نزدیک وہ تمام صفات و اعمال اخلاق کے زمرے میں شمار ہوں گے جو انسان کی عقل کو اس کے حیوانی میلانات پر حاکم بنانے میں مدد دیں۔

۴۔اخلاق اور دیگر پسندی

فلاسفہ کی وہ جماعت جو زیادہ تر معاشرے کے بارے میں سوچتے ہیں اور فرد کی بجائے معاشرے کو اصل قرار دیتے ہیں،ان کی نظر میں وہ افعال اخلاق کہلاتے ہیں جن کا مقصد دوسروں کو فائدہ پہنچانا ہو اور ہر وہ چیز جس کا فائدہ دوسروں کی بجائے اپنے آپ کو پہنچے،وہ غیر اخلاقی ہے۔

۵۔اخلاق اور ضمیر پرستی

وہ فلاسفہ جو عقل انسانی کی بجائے ضمیر انسانی کو اصل قرار دیتے ہیں،جنہیں ''ضمیر پرست'' کا نام دیا جا سکتا ہے،وہ ایسے امور کو معیار اخلاق قرار دیتے ہیں جن کا حکم انسانی ضمیر دیتا ہے۔یہ وہ امور ہیں جن کو ضمیر انسانی بغیر عقلی استدلال کے ضروری قرار دیتا ہے،مثلاً انسانی ضمیر عدل کو اچھا اور ظلم کو برا،ایثار کو اچھا اور خود پرستی کو برا،شجاعت کو اچھا اور بزدلی کو برا کہتا ہے۔

اس مکتب فکر کی تاکید اس بات پر ہے کہ اخلاقی ضمیر کو زندہ و بیدار کیا جائے اور ہر چیز جو اخلاقی ضمیر کو کمزور کرتی ہے،اس کا خاتمہ ہونا چاہیے تاکہ انسانی ضمیر اچھے اور برے کے درمیان ایک اچھے جج کی طرح فیصلہ کر سکے۔

حسن و قبح عقل کے طرفدار اگرچہ عقل کی بات کرتے ہیں لیکن ان کی مراد عقل استدلالی نہیں بلکہ عقل وجدانی ہے جس کا دوسرا نام اخلاقی ضمیر ہے۔وہ کہتے ہیں کہ احسان کا حسن اور ظلم کا قبح ثابت کرنے کے لیے کسی عقلی استدلال کی ضرورت نہیں ہے،بلکہ

سلیم النفس انسان کے ضمیر پر یہ حقیقت خود بخود آشکار ہے۔

لیکن ان فلاسفہ میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اس حقیقت کا انکار نہیں کرتے کہ ممکن ہے بعض امور میں اخلاقی ضمیر کوئی فیصلہ نہ کر سکتا ہو بلکہ خاموش ہو۔ ایسے مرحلہ پر اخلاقی امور کو غیر اخلاقی امور سے پہچاننے کے لیے وحی اور شریعت سے رہنمائی لینے کی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر عقل کے حکم کو شریعت کی تائید حاصل ہو جائے تو انسان زیادہ اطمینان کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہوگا۔

نتیجہ

اہم اخلاقی مکاتب فکر کے بارے میں مختصر گفتگو سے اسلام کے اخلاقی مکتب فکر کی برتری واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اس نظام کی بنیاد اس خدا پر ایمان ہے جو کمال مطلق اور مطلق کمال ہے اور اس کا حکم تمام موجودات پر حاکم ہے۔ انسانوں کا کمال اس میں ہے کہ اس کی صفات جمال وجلال کا عکس اپنے اندر پیدا کریں اور اس کی ذات مقدس سے نزدیک سے نزدیک تر ہوں۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اخلاقی صفات انسانی معاشرے کی فلاح اور انسانوں کی مشکلات سے نجات دینے میں موثر نہیں ہیں۔ صحیح اسلامی نظریۂ کائنات، ساری کائنات کو ایک اکائی کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ ذات واجب الوجود یعنی اللہ تعالیٰ اس دائرے کا مرکز اور ماسوا اللہ ہر چیز، اس سے متصل اور ایک دوسرے کے ساتھ بھی باہم پیوستہ ہیں۔ بنا برایں ہر وہ چیز جو فرد کے لیے مفید ہے، معاشرے کے لیے بھی مفید ہے اور ہر چیز جو معاشرے کے لیے مفید ہے، فرد کے لیے بھی مفید ہے۔

بالفاظ دیگر اخلاقی اقدار دو طرفہ اثر رکھتی ہیں۔ وہ فرد کی بھی تعمیر کرتی ہیں اور معاشرے کی بھی۔ جو لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ اخلاقی امور صرف وہی ہیں جو دوسروں کے لیے مفید ہوں، نہ کہ اپنے لیے، وہ بہت بڑی غلطی پر ہیں۔ اس لیے کہ فرد اور معاشرہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ اگر کہیں ان دونوں میں جدائی نظر آتی بھی ہے تو وہ بہت محدود اور مختصر ہے۔ ہم اس بات کی وضاحت پہلے بھی کر چکے ہیں۔ مناسب مواقع پر اس کی مزید وضاحت ہوتی رہے گی۔

اہم نکات

ا۔ اخلاق اور نسبیت (Relativity)

آیا اچھے اور برے اخلاق اور فضائل ورذائل مطلق (Absolute) ہیں یا نسبی (Relative)، مثلاً شجاعت، ایثار اور اپنے نفس پر تسلط رکھنا، بغیر کسی استثناء کے ہر زمان ومکان میں اچھی صفات تصور کی جا سکتی ہیں، یا یہ کہ ان کا اچھا یا برا ہونا نسبی (Relative) ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ صفات بعض معاشروں میں اور بعض زمانوں اور بعض جگہوں پر اچھی

ہیں اور بعض میں بری؟

جو حضرات اخلاق کو نسبی سمجھتے ہیں، ان کے دو گروہ ہیں:

پہلا گروہ ان لوگوں کا ہے جو نسبیت کو سارے عالم وجود پر حاکم سمجھتے ہیں۔ جب وجود اور عدم نسبی ہوں تو اخلاق بھی لامحالہ نسبی ہوں گے۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو وجود اور اخلاق کے درمیان کسی تعلق کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے یہاں اخلاقی فضائل و رذائل کی شناخت کا معیار معاشرے میں ان کی قبولیت یا عدم قبولیت ہے۔ اس طرح ایک ہی صفت مثلاً شجاعت کسی معاشرے میں مقبول اور کسی معاشرہ میں غیر مقبول ہو۔ جس معاشرے میں یہ مقبول ہو، وہاں اس کا شمار اخلاقی فضائل میں ہوگا۔ جہاں یہ غیر مقبول ہو، وہاں اس کا شمار رذائل اخلاقی میں ہوگا۔

یہ گروہ اخلاقی افعال کے حسن و قبح کو بھی معاشرے کے رد و قبول کے معیار پر جانچتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ذاتی طور پر کوئی بھی فعل اچھا یا برا نہیں ہوتا۔

جیسا کہ ہم گزشتہ بحث میں بیان کر چکے ہیں، اخلاقی مسائل کا تعلق ان معیاروں سے ہے جو نظریۂ کائنات سے جنم لیتے ہیں، جو معاشرے کو ہی اصل سمجھتے ہیں، وہ بھی اس کی خالص مادی شکل میں۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ اخلاق کو نسبی سمجھیں۔ اس لیے کہ انسانی معاشرہ ہر وقت تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے اور اس کی مادی شکل بھی بدلتی رہتی ہے۔ لہٰذا یہ بات باعث تعجب نہیں ہوگی کہ اگر یہ گروہ معاشرتی رد و قبول کو اچھے اور برے اخلاق کی شناخت کا معیار قرار دے۔

اس طرزِ فکر کا نتیجہ واضح ہے۔ اس طرزِ فکر کی رو سے اخلاقی اصول معاشرے کے رہنما اور پیشرو ہونے کی بجائے معاشرے کے تابع ہوں گے۔ اس طرزِ فکر کے مطابق زمانۂ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا ایک اخلاقی فعل تھا کیونکہ معاشرہ اسے قبول کرتا تھا۔ اسی طرح غارت گری جو زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے لیے باعث فخر تھی، وہ بھی ایک اخلاقی فعل محسوب ہوگی۔ اسی طرح ہم جنسیت ان معاشروں میں ایک اخلاقی فعل شمار ہوگی جہاں یہ بدبختی موجود ہے۔

اس قسم کے مکاتب فکر انسانی معاشروں کے لیے جس قسم کے مہلک اثرات اور خطرات کا باعث ہو سکتے ہیں، وہ کسی عاقل پر پوشیدہ نہیں ہے۔

اسلام میں اخلاقی فضائل و رذائل کا معیار اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہوتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسہ ثابت اور نا قابل تغیر ہے، لہٰذا اسلام میں اخلاقی معیار بھی مستقل اور نا قابل تغیر ہے۔ انسانی معاشروں اور افراد کا فرض ہے کہ اسلام کے اخلاقی نظام کی پیروی کریں، نہ کہ اسے اپنا تابع بنائیں۔

خدا پرست، انسانی فطرت اور اخلاقی ضمیر کو بھی اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسہ کا پرتو سمجھتے ہیں، بشرطیکہ یہ آلودہ نہ ہو چکے ہوں۔ اس لیے اخلاقی ضمیر پر مبنی اخلاق اور حسن و قبح عقلی (عقل عملی مراد ہے) ثابت اور مستقل سمجھتے ہیں۔ اسلام اخلاق کے نسبی ہونے کی نفی

کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی متعدد آیات میں اچھے اور برے یا بالفاظ دیگر ''خبیث'' و ''طیب'' کو بطور مطلق بیان کیا ہے اور اس سلسلہ میں انسانی معاشرے کے حالات کو غیر موثر قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے:

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ

''کہہ دیجئے کہ طیب اور خبیث کبھی برابر نہیں ہو سکتے، خواہ خبیثوں کی کثرت آپ کے لیے حیران کن ہو۔'' (مائدہ:۱۰۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ

''وہ ان کے لیے طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام ٹھہراتا ہے۔'' (اعراف:۱۵۷)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾

''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر فضل اور احسان کرتا ہے لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔'' (بقرہ:۲۴۳)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

''آپ جس قدر اصرار کریں لوگوں کی اکثریت مومن نہیں بنے گی۔'' (یوسف:۱۰۳)

ان تمام آیات میں ایمان، پاکیزگی اور شکر کو ایک ''قدر'' (Value) قرار دیا گیا ہے، خواہ لوگوں کی اکثریت ان کی مخالف ہو۔ اسی طرح کفر، ناپاکی اور ناشکری کو منفی قدریں قرار دیا گیا ہے، اگرچہ اکثریت انہیں اپنائے ہوئے ہو۔

امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے خطبات میں، جو نہج البلاغہ میں مندرج ہیں، بار بار اس بات پر تاکید کی ہے کہ آپ کسی عمل یا قدر کا لوگوں کی اکثریت کی طرف سے رد یا قبول ہونا معیار فضیلت و رذیلت نہیں ہے۔ ایک جگہ آپؑ فرماتے ہیں:

ایها الناس لا تستو حشوا فی طریق الهدی لقلة اهله فان الناس قد اجتمعوا علی مائدة شبعها قصیر وجوعها طویل

''اے لوگو! راہ حق پر چلتے ہوئے اس وجہ سے وحشت زدہ نہ ہو جانا کہ اس پر چلنے والے کم ہیں، اس لیے کہ لوگ ایک ایسے دسترخوان کے گرد جمع ہو گئے ہیں جس کی سیری مختصر اور بھوک طویل ہے۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ ۲۰۱)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

حق و باطل، ولکل اھل؛ فلئن امر الباطل لقدیما فعل، ولئن قل الحق فلربما ولعل

''حق اور باطل دونوں موجود ہیں اور دونوں کے حامی اور طرفدار بھی موجود ہیں۔ اگر باطل کی حکمرانی قائم ہوجائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس لیے کہ ہمیشہ ایسا ہوتا آیا ہے اور اگر حق کے پیرو کم ہیں تو عین ممکن ہے کہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوجائے (اور وہ کامیاب ہوجائیں)۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۶)

یہ سب باتیں اخلاق کے نسبی ہونے کی نفی کرتی ہیں اور معاشرے کی اکثریت کے ردوقبول کو اعمال اور اخلاق کے اچھا یا برا ہونے کا معیار نہیں مانتی ہیں۔

قرآن مجید اور ارشاداتِ معصومینؑ میں اس حقیقت کے بہت سے شواہد موجود ہیں۔ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جائے گی۔

سوال

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آسمانی شریعتوں، خصوصاً اسلام کی تعلیمات میں بھی کہیں کہیں نسبت کو قبول کیا گیا ہے، مثلاً اسلام جھوٹ کو ایک غیر اخلاقی عمل قرار دیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود لوگوں کے درمیان اصلاح کے لیے اسے اخلاقی عمل سمجھا جاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں ایسی مثالیں کم نہیں ہیں۔ یہ کسی حد تک اخلاق اور حسن وقبح کے نسبی ہونے کو قبول کرنے کے مترادف ہے۔

جواب

یہ ایک اہم سوال ہے اور اس کا جواب بھی واضح ہے۔ وہ یہ کہ اخلاق یا حسن وقبح کا نسبی ہونا اور بات ہے اور مختلف مباحث میں استثناء کا موجود ہونا ایک الگ بات ہے۔

بالفاظ دیگر نسبیت میں کوئی ثابت اور مستقل معیار موجود نہیں ہے۔ اس میں جھوٹ اچھا ہے نہ برا۔ اسی طرح احسان اور ظلم کا بھی یہی حال ہے۔ ان کے اچھا یا برا ہونے کا فیصلہ اس بات سے ہوگا کہ کسی معاشرے کی اکثریت انہیں قبول کرتی ہے یا رد کرتی ہے۔

لیکن اسلام کی تعلیمات میں جھوٹ، ظلم، بخل، کینہ اور حسد وغیرہ غیر اخلاقی افعال ہیں، خواہ اکثریت انہیں قبول کرے یا نہ کرے۔

یہ ایک ثابت اور مستقل اصول ہے لیکن کہیں کہیں کسی استثنائی صورتحال کا پیدا ہوجانا عین ممکن ہے۔ لہٰذا استثناعات کا پایا جانا جو کہ ہر کلی قاعدے میں پائے جاتے ہیں، نسبیت کی دلیل نہیں ہوسکتے۔ اگر ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح ملحوظ رکھا جائے تو بہت سی

غلط فہمیوں کا سد باب ہو جائے گا۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ موضوعات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ چونکہ احکام موضوعات کے تابع ہیں، اس لیے ان میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ کو کسی صورت میں نسبیت کی دلیل نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

اس بات کی وضاحت اس طرح سے کی جا سکتی ہے کہ ہر حکم کا ایک مخصوص موضوع ہوتا ہے، مثلاً کسی شخص کے جسم پر زخم لگانا ایک جرم ہے جس کا قصاص لینا واجب ہے۔ لیکن بعض اوقات موضوع بدل جاتا ہے۔ ایک جراح ایک چاقو ہاتھ میں لے کر ایک مریض کی جان بچانے کے لیے اس کا پیٹ چاک کر دیتا ہے یا اس کے قلب کو شگافتہ کر دیتا ہے تاکہ اس کے دل کی رگوں کی اصلاح کر سکے۔ ایسی صورت میں موضوع بدل جاتا ہے اور یہ عمل جرم نہیں کہلاتا بلکہ طبیب اور جراح قابل تعریف اور انعام کے حقدار قرار دیئے جاتے ہیں۔

موضوعات کی تبدیلی سے احکام میں رونما ہونے والی تبدیلی کو نسبیت کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نسبیت یہ ہے کہ کوئی موضوع اپنی ماہیت میں کسی قسم کی تبدیلی کے بغیر، مختلف اشخاص یا مختلف اوقات میں مختلف احکام کا محکوم ہو جائے۔

شرعی احکام بھی اسی طرح سے ہیں۔ شراب حرام اور نجس [1] ہے۔ لیکن اگر وہ سرکہ میں تبدیل ہو جائے تو پاک اور حلال ہے۔ اس بات کا نسبیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نسبیت یہ ہے کہ جو معاشرے شراب کو پسند کرتے ہیں، وہ شراب کو حلال قرار دیں اور جو معاشرے اسے ناپسند کرتے ہیں، وہ اسے حرام قرار دیں۔

اخلاقی مسائل میں بھی بعض اوقات ہمارا سامنا ایسے موضوعات سے ہوتا ہے جو ایک صورت میں فضیلت اور اس شکل کے تبدیل ہو جانے سے رذیلت بن جاتے ہیں۔ حد اعتدال میں نڈر ہونا شجاعت ہے جو ایک فضیلت ہے۔ لیکن اگر یہ حد اعتدال سے نکل کر تہور کی صورت اختیار کر لے تو یہ فضیلت سے نکل کر رذیلت بن جاتی ہے یا یہ کہ جھوٹ، جہاں عام طور پر برائی کا سبب اور اعتماد کی کمزوری کا سبب ہوتا ہے، حرام اور رذیلت ہوتا ہے۔ لیکن جہاں اس کا مقصد لوگوں کے تعلقات میں بہتری پیدا کرنا ہو، وہاں حلال اور فضیلت بن جاتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ موضوع کی اس تبدیلی کو نسبیت کا نام دینا چاہیں، ہم نام رکھنے کے معاملہ میں ان سے کوئی اختلاف نہیں کرتے اور یہ اختلاف ہمارے نکتہ نظر سے ایک لفظی اختلاف ہے، اس لیے کہ ایسی صورت میں موضوع اور ماہیت میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اگر نسبیت کے طرفداروں کا مؤقف بھی یہی ہو تو ہمارا ان سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ مسئلہ اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ ہم کسی موضوع کے ایک ہی حالت پر ہوتے ہوئے معاشرے کی اکثریت کی پسند و ناپسند کو فضیلت و رذیلت اور حسن و قبح کا معیار قرار دیں۔

مذکورہ بالا بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اسلام، قرآن، عقل اور منطق کی رو سے اخلاق کا نسبی ہونا غلط ہے۔ درحقیقت اخلاق کا نسبی ہونا اخلاق کی نفی کے مترادف ہے، اس لیے کہ اخلاق کے نسبی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو برائی معاشرے میں

---

[1] شراب کے نجس ہونے میں فقہا میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ صحیح فتویٰ یہ ہے کہ شراب حرام ہے مگر نجس نہیں ہے۔

عام ہو جائے، وہ فضیلت ہے۔ وسیع پیمانہ پر پھیلنے والی ہر اخلاقی بیماری صحت اور سلامتی سمجھی جانے لگے گی۔ اس طرح اخلاق معاشرے کی اصلاح کی بجائے معاشرہ میں بگاڑ اور خرابی کا سبب بن جائے گا۔

۲۔اخلاق اور رویے کا متقابل اثر

اخلاق اور عمل کا باہمی تعلق اور اخلاق کا انسان کے عمل پر اثر کسی پر پوشیدہ نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اعمال عام طور پر ہمارے اندرونی صفات کی بنیاد پر انجام پاتے ہیں۔جس شخص کے دل میں بخل، حسد یا تکبر نے ٹھکانہ بنالیا ہو اور اس کی فکر اور روح کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہو، ظاہر سی بات ہے کہ اس کے اعمال بھی اس رنگ سے متاثر ہوتے ہیں۔ایک حاسد شخص کے اعمال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حسد کی آگ اس کے دل میں جل رہی ہے اور کسی پل اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔اس طرح متکبر افراد کی تمام حرکات وسکنات میں تکبر کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔تمام اچھی اور بری اخلاقی صفات کا انسان کے اعمال پر اسی طرح کا اثر ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض محققین نے ان اعمال کو اخلاقی اعمال کا نام دیا ہے، اس لیے کہ یہ اعمال انسان کی اخلاقی صفات سے ظاہر ہوتے ہیں۔اس کے مقابل وہ اعمال ہوتے ہیں جو کبھی انسان سے سرزد ہوتے ہیں، مثلاً وہ اعمال جو امر بالمعروف، نہی از منکر یا کسی نصیحت کے زیر اثر سرزد ہوتے۔البتہ ان اعمال کا تناسب اخلاقی اعمال کی نسبت کم تر ہوتا ہے۔

یہاں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ معاشرے کی اصلاح کے لیے اور لوگوں کے اعمال کی اصلاح کے لیے اخلاقی بنیادوں کی اصلاح کرنا ہوگی، اس لیے کہ زیادہ تر اعمال کی بنیاد اخلاقی صفات ہوتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انبیائے الٰہی اور اسلامی معاشرے کے مصلحین کی زیادہ تر کوشش یہی رہی ہے کہ صحیح تربیت کے ذریعے معاشرے کے افراد میں اخلاقی فضائل کو پروان چڑھائیں اور رذائل اخلاقی کو کم سے کم حد تک لے جائیں تاکہ اس طریقہ سے لوگوں کے اعمال کی اصلاح کی جا سکے۔قرآن شریف میں تزکیہ نفس کی جو اصطلاح استعمال کی گئی ہے، وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

جس طرح اخلاق ہمارے اعمال پر اثر انداز ہوتا ہے، اسی طرح ایک عمل کو بار بار انجام دینے سے اس کا اثر انسان کے اخلاق پر بھی پڑتا ہے۔اس لیے کہ انسان کا ہر عمل اس کی روح پر اثر انداز ہوتا ہے۔عمل کو جس قدر دہرایا جائے، اسی قدر روح پر اس کا اثر بھی گہرا ہوگا اور بتدریج وہ عمل ایک پختہ عادت میں تبدیل ہو جائے گا۔مزید تکرار سے یہ عمل عادت سے گزر کر ایک ''حالت'' اور ''ملکہ'' میں تبدیل ہو جاتا ہے اور انسان کی ایک اخلاقی صفت بن جاتا ہے۔

اس طرح عمل اور اخلاق ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے معرضِ وجود میں آنے کا سبب بنتا ہے۔اس حقیقت کا قرآن مجید اور احادیث میں وسیع پیمانے پر ذکر ملتا ہے۔

اہل جہنم کی بعض خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ⑭

''ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ان کے اعمال نے ان کے دلوں کو زنگ آلود کر دیا ہے۔'' (مطففین: ۱۴)

یہاں سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ برے اعمال زنگ کی طرح دل پر اثر کرتے ہیں اور اس کے فطری نور اور پاکیزگی کو برطرف کر کے اسے تاریک کر دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے:

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ⑧①

''جو کوئی برائی کا مرتکب ہوا اور اس کی خطا اس کے وجود پر مکمل طور پر چھا جائے، وہ جہنمی ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔'' (بقرہ: ۸۱)

انسان کے وجود پر گناہ کے مکمل طور پر چھا جانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کا اثر انسان کی روح پر اس قدر زیادہ ہو جائے کہ اسے تاریک کر دے اور اسے گناہ کے رنگ میں رنگ دے۔ جب انسان کی یہ حالت ہو جائے تو کوئی نصیحت اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ گویا انسان کی ماہیت ہی بدل جاتی ہے۔ بار بار گناہ کرنے کے نتیجہ میں نہ صرف انسان کی اخلاقی صفات بلکہ اس کے عقائد و نظریات بھی بدل جاتے ہیں۔

جیسا کہ کفر پر اڑے رہنے والے افراد کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۧ

''اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔'' (بقرہ: ۷)

ظاہر سی بات ہے کہ اللہ کسی سے عداوت اور کینہ نہیں رکھتا کہ اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دے۔ درحقیقت یہ ان کے اعمال کا نتیجہ ہے جو حجاب اور پردوں کی صورت میں انسان کے حواس کو ڈھانپ لیتا ہے اور انسان کو حقیقت کے ادراک سے روک دیتا ہے۔ (ایسے امور کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دینے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر سبب اور مسبب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے کیونکہ اس کی ذات ہی مسبب الاسباب ہے)۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ برے اعمال انسان کے عقیدہ کو بھی تباہ کر دیتے ہیں:

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْٓآٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا

يَسْتَهْزِءُوْنَ﴿۱۰﴾

''جن لوگوں نے برے اعمال انجام دیئے، آخر ان کا حال یہ ہوا کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑاتے رہے۔'' (روم:۱۰)

ان الفاظ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اگر انسان مسلسل برے کام کرتا رہے تو اس کا اثر انسان کی روح میں بہت گہرائی تک ہوتا ہے اور نہ صرف اس کے اخلاق بلکہ اس کے عقائد کو بھی تباہ و برباد کر دیتا ہے۔

قرآن شریف میں تو یہاں تک بیان ہوا ہے کہ برے اعمال کی مسلسل انجام دہی سے انسان کی اچھائی اور برائی کی پہچان کی صلاحیت بھی متاثر ہوتی ہے۔ نیکی اسے بدی نظر آنے لگتی ہے اور بدی کو نیکی سمجھنے لگتا ہے۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا﴿۱۰۴﴾

''کہہ دیجئے کہ آیا میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے کون ہیں؟ یہ وہ ہیں جن کی کوششیں دنیوی زندگی میں بھٹک گئیں (اور انہوں نے سارا الٰہی سرمایہ برباد کر دیا) اس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔'' (کہف:۱۰۳، ۱۰۴)

ایک اور مقام پر مسلسل جھوٹ بولنے اور اللہ سے وعدہ خلافی کو نفاق کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ﴿۷۷﴾

''ان کے عمل نے ان کے دلوں میں ایسا نفاق پیدا کر دیا جو اس دن تک ان کے ساتھ رہے گا جب وہ اللہ سے ملاقات کریں گے، ایسا اس لئے ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ خلافی کی اور مسلسل جھوٹ بولتے رہے۔'' (توبہ:۷۷)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیت میں لفظ ''یکذبون'' استعمال ہوا ہے جو استمرار اور تسلسل پر دلالت کرتا ہے اور نفاق کی پیدائش میں اس عمل کی تاثیر کو بیان کرتا ہے، اس لئے جھوٹ بولنا اور اسے سچ ظاہر کرنا انسان کے ظاہر و باطن کے اختلاف کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس حالت کے مستقل ہو جانے کا نام نفاق ہے۔

اخلاق اور عمل کا متقابل اثر احادیث کی روشنی میں

یہ حقیقت کہ انسان کے اچھے اور برے اعمال اس کی روح پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اچھی بری صفات کی تشکیل کرتے ہیں،

احادیث میں بھی وسیع پیمانہ پر بیان ہوئی ہے۔ نمونہ کے طور پر چند احادیث درج کی جاتی ہیں:

۱۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

کان ابی یقول ما من شی افسد للقلب من خطیئة، ان القلب لیواقع الخطیئة فما تزال به حتی تغلب علیه فیصیر اعلاه اسفله

''میرے والد (حضرت امام محمد باقر علیہ السلام) فرماتے تھے کہ گناہ سے بڑھ کر کوئی چیز انسان کے دل کو تباہ نہیں کرتی۔ گناہ دل پر اثر انداز ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس پر غالب آ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کا دل الٹ جاتا ہے اور اس کا اوپر کا حصہ نیچے ہو جاتا ہے۔'' (اصول کافی، ۲:۲۶۸)

۲۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اذا اذنب الرجل خرج فی قلبه نکتة سوداء فان تاب انمحت وان زادزادت، حتی تغلب علی قلبه، فلا یفلح بعدها ابدا

''جب انسان گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے تو وہ نقطہ مٹ جاتا ہے۔ اگر وہ مزید گناہ کرتا رہے تو یہ نقطہ بھی بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ سارے دل پر چھا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ کبھی فلاح نہیں پا سکتا۔'' (اصولِ کافی، ۲:۲۷۱)

اسی بنیاد پر احادیث میں گناہ پر اصرار کرنے کے بارے میں بہت تنبیہ کی گئی ہے، یہاں تک کہ گناہِ صغیرہ پر اصرار کو بھی گناہِ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ (بحارالانوار، ۱۰:۳۵۹)

حلال وحرام اور فرائض وسنن کے بارے میں مامون کے ایک سوال کے جواب میں حضرت امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں کہ گناہ صغیرہ پر اصرار کرنا اسے گناہِ کبیرہ میں بدل دیتا ہے۔ (بحارالانوار، ۱۰:۳۶۶)

۳۔ کتاب ''الخصال'' میں ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اربع خصال یمتن القلب: الذنب علی الذنب.........

''چار چیزیں دل کو مردہ کر دیتی ہیں: گناہ پر گناہ کرتے چلے جانا............'' (خصال، ۱:۲۵۲)

دارالمنثور، جلد ۶ صفحہ ۳۲۶ پر بھی ایسی ہی احادیث مندرج ہیں۔

ان احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی عمل کا تکرار یقینی طور پر انسان کے دل اور جان پر اثر انداز ہوتا ہے اور بری صفات کی تشکیل کا سبب بنتا ہے۔ اسی لئے تاکید کی گئی ہے کہ جب بھی مومن سے گناہ سرزد ہو تو اسے چاہئے کہ فوراً توبہ کے پانی سے اپنے قلب کو دھوئے اور گناہ کے منفی اثرات کو مٹا دے تاکہ گناہ اس کی مستقل باطنی کیفیت نہ بن جائے۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر یہ

حکم دیا گیا ہے کہ معصومین علیہم السلام کی نورانی احادیث سے دلوں کے زنگ کو برطرف کیا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ:

ان القلوب لترین کما یرین السیف وجلائہ الحدیث (نورالثقلین، ۵: ۵۲۳)

''لوگوں کے دل زنگ آلود ہوجاتے ہیں جیسے تلوار زنگ آلود ہوجاتی ہے، اس کی چمک حدیث ہے۔''

۳۔ انفرادی اور اجتماعی اخلاق

ایک اور اہم مسئلہ جس کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ آیا اخلاقی مسائل دوسروں کے ساتھ رابطہ کی صورت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں؟ جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص بالکل تنہا زندگی بسر کر رہا ہو تو اس کے لیے اخلاق ایک بے معنی چیز ہوگی؟ یا یہ کہ بعض اخلاقی مفاہیم اکیلے انسان پر بھی صادق آتے ہیں۔ اگرچہ اخلاقی مسائل کا بڑا حصہ دوسروں کے ساتھ رابطہ کی صورت میں تشکیل پاتا ہے، آیا اس لحاظ سے اخلاق کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں ہم آپ کی توجہ اس بحث کی طرف مبذول کراتے ہیں جو ''زندگی در پرتو اخلاق'' میں آئی ہے:

''بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ تمام اخلاقی مسائل کا تعلق انسان کے دوسروں کے ساتھ معاشرتی رابطوں کے ساتھ ہے۔ اگر معاشرہ موجود نہ ہو اور ہر شخص تنہا اور دوسروں سے الگ تھلگ زندگی گزار رہا ہو اور کسی کو دوسرے کی خبر تک نہ ہو تو ایسی صورت میں اخلاق کے کوئی معنی نہ ہوتے۔

اس لئے کہ رشک، حسد، تواضع، تکبر، حسن ظن، عدالت، ظلم، عفت، سخاوت اور ان جیسی صفات صرف معاشرے میں انسانوں کے ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ اور تعلق کی صورت میں ہی کوئی مفہوم رکھ سکتی ہیں۔ لہٰذا معاشرے کے بغیر انسان اخلاق کے بغیر انسان ہوگا۔

لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگرچہ بہت سے فضائل و رذائل اخلاقی کا تعلق انسان کی معاشرتی زندگی سے ہے لیکن یہ کوئی عام قانون نہیں ہے۔ بہت سے اخلاقی مسائل ایسے ہیں جن کا تعلق صرف انفرادی زندگی سے ہے اور وہ ایک اکیلے انسان پر بھی مکمل طور پر صادق آتے ہیں، مثلاً مسائل اور مشکلات پر صبر یا جزع، حوادث کے مقابل شجاعت یا بزدلی، اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سستی یا استقامت، خالق کائنات کے بارے میں توجہ یا غفلت، اس کی وسیع و بے انتہا نعمتوں پر شکرگزاری یا ناشکری اور اس قسم کے بعض دیگر امور ایسے ہیں جنہیں علمائے اخلاق نے کتب اخلاق میں زیر بحث قرار دیا ہے اور انہیں فضائل و رذائل اخلاقی میں شمار کیا ہے۔ یہ تمام امور ایسے ہیں جو انفرادی بھی ہوسکتے ہیں اور اگر کوئی انسان معاشرے سے الگ تھلگ بھی ہو تو یہ اس پر صادق آسکتے ہیں۔ یہاں سے اخلاق کی انفرادی اخلاق اور اجتماعی اخلاق میں تقسیم کا مسئلہ واضح ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ علم اخلاق میں اجتماعی اخلاق کی حیثیت زیادہ وزنی ہے اور انسان کی شخصیت کا زیادہ تر دارومدار اسی پر ہے۔ اگرچہ انفرادی اخلاق بھی انسان کی شخصیت کی تشکیل

میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔[1]

ظاہر سی بات ہے کہ اخلاق کی اس تقسیم سے اخلاقی مسائل کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ البتہ اس سے گروہ بندی کے لحاظ سے اخلاقی مباحث کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس بحث پر وقت صرف کرنا کہ کون سی اخلاقی صفات صرف انفرادی پہلو رکھتی ہیں اور کون سی اخلاقی صفات صرف اجتماعی پہلو رکھتی ہیں، مفید معلوم نہیں ہوتا۔ ہم اس سلسلہ میں مذکورہ بالا کلی اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ تاہم اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انفرادی اخلاق بھی معاشرتی مسائل پر بالواسطہ اثر انداز ہوتا ہے۔

[1] زندگی در پرتو اخلاق، صفحہ 29 تا 31

چوتھا باب

اخلاقی بنیادیں

اگر اخلاق کو ایک بڑے پھلدار درخت سے تشبیہ دی جائے تو اخلاقی سہاروں کو باغبان اور پانی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ اگر باغبان یا پانی نہ ہوتو درخت خشک ہوجائے گا یا مختلف قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہوجائے گا جن کے نتیجہ میں اس کی موت واقع ہو جائے گی یا اس کے پھل میں کمی ہوجائے گی۔

علمائے اخلاق اور فلاسفہ نے اخلاق کے لیے جن سہاروں کا ذکر کیا ہے، وہ مختلف اقسام کے ہیں۔ درحقیقت ان کا تعلق ان کی جہاں بینی (نظریۂ کائنات) سے ہے۔ ہم یہاں ان میں سے چند اہم نمونوں کی طرف اشارہ کریں گے:

ا۔ منفعت طلبی کی بنیاد

ایک گروہ صرف اس لئے اخلاقی مسائل پر تاکید کرتا ہے کہ مادی مفادات کا اس کے ساتھ براہِ راست تعلق ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک معاشی ادارہ امانت اور سچائی کے اصولوں پر اچھی طرح کار بند رہے تو وہ لوگوں کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ اپنی طرف جذب کرسکتا ہے جس کے نتیجہ میں اسے بھاری منافع حاصل ہوگا۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض افراد مختلف حالات میں مختلف طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں، مثلاً جب وہ بنک میں کام کر رہے ہوتے ہیں اور لوگوں کے سرمایہ کے ساتھ سروکار رکھتے ہیں تو بہت ایمانداری برتتے ہیں تاکہ اپنے بنک یا ادارہ کے لیے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرسکیں۔ لیکن جیسے ہی اپنے ادارہ سے باہر آتے ہیں تو ممکن ہے کہ ایک خائن انسان بن جائیں۔ اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ اب ان کا منافع خیانت سے وابستہ ہو۔

اس کی ایک اور مثال یہ دی جاسکتی ہے کہ ممکن ہے ایک تاجر یا دکاندار اپنے گاہکوں کے ساتھ بہت محبت اور خوش اخلاقی سے پیش آتا ہو تاکہ اس طریقہ سے زیادہ سے زیادہ گاہک اپنی طرف کھینچ سکے لیکن ممکن ہے کہ یہی شخص اپنے گھر میں بیوی بچوں سے اور ہمسایوں سے بدزبانی اور بداخلاقی سے پیش آتا ہو۔

یہ اخلاق جس کی بنیاد منفعت طلبی ہے، اس کا سب سے بڑا نقص اور عیب یہ ہے کہ یہ اخلاق کے لیے کسی اصل اور بنیادی اہمیت کا قائل نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ طرزِ فکر ہر وقت اور ہر لحظہ مفاد اور منفعت کی طلب میں گامزن رہتا ہے، خواہ یہ فائدہ اور منفعت اخلاق میں ہو یا خلافِ اخلاق میں۔

بعض لوگ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ اخلاق کا مقصد ذاتی فوائد و منافع نہیں بلکہ معاشرتی مفاد اور اجتماعی مصالح

ہونا چاہئے، اس لیے کہ اگر انسانی معاشرے میں اخلاقی بنیادیں متزلزل ہو جائیں تو دنیا ایک ایسے جہنم میں تبدیل ہو جائے گی جہاں سب عذاب میں ہوں گے اور وہ تمام مادی وسائل جو زندگی کو بہتر بنانے میں کام آ سکتے ہیں، اس جہنم کا ایندھن بن جائیں گے۔

اس گروہ کا طرزِ فکر اگرچہ نسبتاً بہتر ہے لیکن جس اخلاق کی بات یہ گروہ کرتا ہے، اس کا مقصد بھی حصولِ منفعت ہے۔ یہ گروہ بھی اخلاقی فضائل کے لیے ذاتی قدر و قیمت کا قائل نہیں ہے۔

وہ مادہ پرست لوگ جو کسی وحی و نبوت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کے پاس اس طرزِ تفکر کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہ لوگ اخلاق کو آسمان کی بلندی سے زمین کی سطح پر لے آتے ہیں اور اسے زیادہ سے زیادہ رفاہ اور آسائش کے حصول کا ذریعہ قرار دینے لگتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسانی معاشرے پر اخلاق کے مثبت مادی نتائج بھی مرتب ہوتے ہیں اور ہم گزشتہ صفحات میں اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ لیکن بحث اس نکتہ پر ہے کہ آیا اخلاق کی بنیاد صرف یہی ہے یا یہ کہ ان نتائج کو علم اخلاق کے ذیلی فوائد اور برکات قرار دیا جائے۔

بہرحال اخلاق کے بارے میں منفعت پرستی پر مبنی نظریہ ایک طرف سے اخلاق کی بنیادی اہمیت کو مخدوش کر دیتا ہے تو دوسری طرف اس کی قدر و قیمت کو کم کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں اخلاق اور مفاد میں تضاد اور ٹکراؤ پیدا ہو جائے، وہاں یہ نظریہ اخلاق کو چھوڑ کر مفاد کی راہ پر چل نکلتا ہے۔

۲۔ عقلی بنیاد

وہ مفکرین جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ عقل ہر چیز پر حاکم ہے اور تمام امور میں عقل کی پیروی کو ضروری قرار دیتے ہیں، ان کے اخلاق کے بنیاد بھی اسی پر ہے کہ عقل نیک و بد کو پہچانتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل اس حقیقت کو بخوبی سمجھتی ہے کہ شجاعت فضیلت اور بزدلی رذیلت ہے۔ امانت و صداقت کمال ہیں اور خیانت اور جھوٹ نقص اور عیب ہیں۔ یہی عقلی ادراک ہمیں فضائل اخلاقی کے حصول اور رذائل اخلاقی سے اجتناب کی طرف راغب کرتا ہے۔

بعض لوگ انسانی ضمیر کو اخلاق کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ضمیر جس کا دوسرا نام عقل عملی ہے، انسان کا بہترین سرمایہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عقل نظری کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے لیکن ضمیر کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا اور یہی انسانیت کا حقیقی رہنما ہو سکتا ہے۔

لہٰذا انسانی ضمیر کا یہ حکم کہ امانت، صداقت، ایثار، سخاوت اور شجاعت اچھی خصوصیات ہیں، اس بات کے لیے کافی ہے کہ ہم ان صفات کے حصول کے لیے متحرک ہو جائیں۔ اسی طرح انسانی ضمیر کا یہ فیصلہ کہ بخل و خود پسندی ناپسندیدہ صفات ہیں، اس بات کے لیے کافی ہے کہ ہم ان صفات سے دوری اختیار کریں۔

اس طرح عقل اور ضمیر ایک ہی نکتہ پر متفق ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ اس میں کوئی

شک نہیں کہ اخلاق کی یہ بنیاد مبنی برحقیقت ہے اور بذاتِ خود اس قابل ہے کہ تربیت نفس اور حصولِ فضائل اخلاقی کی محرک ہو سکے۔ لیکن جیسا کہ یہ بات اپنے مقام پر ثابت ہے کہ ضمیر کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے اور برے کاموں کو بار بار انجام دینے کے نتیجہ میں ضمیر بے اثر ہو جاتا ہے اور کبھی تو ضمیر مردہ ہو کر بدی کو نیکی اور نیکی کو بدی سمجھنے لگتا ہے، اس کے علاوہ انسانی ضمیر اپنے تمام تر تقدس کے باوجود بعض اوقات خطا کا مرتکب بھی ہو جاتا ہے، لہٰذا ان تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف عقل اور ضمیر پر بھروسہ کرتے ہوئے دیگر عوامل سے بے نیاز نہیں ہوا جا سکتا بلکہ ضروری ہے کہ ایسی مضبوط اور نا قابل فریب بنیادوں کو تلاش کیا جائے جو نہ تو غیر اخلاقی اعمال کے نتیجہ میں بے اثر ہوں اور نہ ہی ان کی ماہیت میں کوئی تبدیلی واقع ہو۔

۳۔ شخصیت کی بنیاد

بعض لوگ اس لئے اخلاقی مسائل کی طرف مائل ہوتے ہیں کہ ان کی نظر میں اخلاقی خصوصیات انسان کی شخصیت میں اضافہ کرتی ہیں۔ ان کے بقول چونکہ انسان اچھی شخصیت کا خواہش مند ہوتا ہے، لہٰذا جب وہ دیکھتا ہے کہ صداقت اور امانت سے شخصیت بنتی ہے تو وہ ان صفات کو اپنانے لگتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ معاشرہ بہادر، سخی، وفادار اور مہربان افراد کے لیے عزت و احترام کا قائل ہے تو وہ ان صفات کا طالب نظر آتا ہے۔

اس کے برعکس جب وہ دیکھتا ہے کہ بزدل، بخیل، کم ہمت، خائن اور بے وفا افراد کی معاشرے میں کوئی حیثیت نہیں ہے تو وہ ان صفات سے دور ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس نظریہ کی بازگشت بھی عقل اور ضمیر کی طرف دکھائی دیتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں انفرادی ضمیر کی بجائے اجتماعی ضمیر کارفرما ہے۔ یعنی جو چیز اجتماعی ضمیر کی رو سے صحیح ہے، وہ فضیلت ہے اور جو چیز اجتماعی ضمیر کے خلاف ہو، وہ رذائل اخلاقی میں شمار ہوگی۔ معاشرے کا یہی اجتماعی فیصلہ انسان کو نیکی کی طرف راغب کرتا ہے اور اسے بدی سے روکتا ہے۔

اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اجتماعی ضمیر اخلاقی اقدار کے لیے ایک موثر محرک ہو سکتا ہے لیکن جن نقائص کی طرف ہم نے انفرادی ضمیر کے ضمن میں اشارہ کیا تھا، وہ سب یہاں بھی صادق آتے ہیں۔

اجتماعی ضمیر بھی خطا کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ اگر حکومتوں کی طرف سے وسیع سطح پر پروپیگنڈا کیا جائے تو ممکن ہے کہ اجتماعی ضمیر نیکی کو بدی اور بدی کو نیکی جاننے لگے۔ تاریخ میں اس کے نمونے بکثرت موجود ہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں عرب معاشرے میں لڑکیوں کو قتل کرنا، حتیٰ کہ انہیں زندہ دفن کرنا ایک اخلاقی فضیلت سمجھا جاتا تھا۔ دورِ حاضر میں بھی بعض ترقی یافتہ معاشروں میں طاقت اور وسائل پر قابض حلقے اپنے ناجائز مفادات کے حصول کے لیے وسیع پیمانے پر پروپیگنڈا کر کے اجتماعی ضمیر کو دھوکہ دیتے ہیں اور غیر اخلاقی چیزوں کو اخلاقی اقدار کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اگرچہ انسان کا ضمیر رحمت الٰہی کی ایک تجلی ہے اور انسان کے اندر اللہ کی عظیم

انسانی عدالت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے، مگر اس کے باوجود وہ معصوم نہیں ہے اور بعض اوقات خطا کا مرتکب ہوجاتا ہے۔ اگر کوئی اطمینان بخش اور معصوم ذریعہ اس کی اصلاح نہ کرے تو ممکن ہے کہ سالہا سال تک وہ اپنی غلط روش پر چلتا رہے۔

۴۔ الٰہی بنیاد

اگرچہ مذکورہ بالا اخلاقی بنیادوں میں سے ہر ایک اخلاقی مسائل کی طرف بڑھنے کے سلسلہ میں ایک کردار ادا کرتی ہے لیکن جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کجی اور انحراف بھی پایا جاتا ہے، جیسا کہ منفعت طلبی کی بنیاد، جو ہر حال میں اپنے راستے پر چلتی ہے اور کبھی اخلاقی مسائل میں سے گزر کرتی ہے اور بعض اوقات ان سے الگ ہوجاتی ہے۔

بعض دیگر بنیادوں میں اگرچہ یہ صورتحال نہیں ہے مگر ان کی قوت اور تاثیر یقیناً محدود ہے۔ ان میں نقائص پائے جاتے ہیں اور بعض اوقات ان سے غلطی بھی سرزد ہوجاتی ہے۔

اگر کوئی بنیاد اور محرک موثر ہونے کے ساتھ ساتھ نقائص سے بھی پاک ہو اور اس میں غلطی کا امکان بھی نہ ہو تو وہ صرف الٰہی بنیاد اور الٰہی محرک ہوسکتا ہے جو وحی کی بنیاد پر قائم اور استوار ہوتا ہے۔

یہاں اخلاقی فضائل کسی منفعت طلبی اور معاشرتی رفاہ کے حصول کا ذریعہ نہیں ہوتے۔ (اگرچہ یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ اخلاق امن وسکون، انفرادی ومعاشرتی رفاہ اور مادی فوائد کا بھی ضامن ہوتا ہے)۔

یہاں یہ بنیادی اہمیت معنوی محرک کی ہوتی ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدسہ جو کمالِ مطلق اور مطلق کمال ہے اور تمام صفاتِ جمال وجلال کی جامع ہے، اخلاق کا مرکز ومحور ہوتی ہے۔ ہر انسان کوشش کرتا ہے کہ خود کو اس کمالِ مطلق کے نزدیک کرے۔ اس کے اسماء وصفات کے پرتو کو اپنی ذات کے اندر پیدا کرے اور روز بروز اس کے قریب تر ہوتا جائے۔ اس راہ پر چلنے والا انسان کسی حد کو قبول اور تسلیم نہیں کرتا بلکہ لامحدود کمال کی طرف گامزن رہتا ہے۔ اس کا باطن کمالِ مطلق یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت سے سرشار ہوتا ہے۔ اس کی ذات وصفات کے انوار سے اس کا باطن منور ہوجاتا ہے اور وہ ہر لحظہ فضیلت وکمال کے اعلیٰ ترین درجات کا طالب ہوتا ہے۔ مادی مفادات اس کے لیے اہمیت نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ اپنی شخصیت میں نکھار پیدا کرنے کے لیے اخلاقی فضائل کا طالب ہوتا ہے۔ اس کی اس تگ ودو کا محرک صرف اخلاقی ضمیر نہیں ہوتا بلکہ وہ ان سب سے بالاتر اور عظیم تر محرک کی بنیاد پر عمل کر رہا ہوتا ہے۔

وہ عقل اور ضمیر کی بجائے وحی سے رہنمائی حاصل کرتا ہے اور ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہوکر اس راہ میں گامزن رہتا ہے۔

قرآن مجید واضح طور پر اخلاقی اعمال کو اللہ اور آخرت پر ایمان کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور بہت سی آیات میں عمل صالح کا ذکر ایمان کے بعد اور شجرۂ ایمان کے ثمر کے طور پر آیا ہے۔

قرآن مجید ایمان کو ایک ثابت اور پائیدار درخت سے تشبیہ دیتا ہے جس کی جڑیں بہت مضبوط اور انسان کے قلب وجان میں بہت گہرائی تک گئی ہوئی ہیں۔ اس کی شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں اور وہ ہر موسم میں پھل دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ایک انتہائی خوبصورت اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصۡلُہَا ثَابِتٌ وَّفَرۡعُہَا فِی السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤۡتِیۡۤ اُکُلَہَا کُلَّ حِیۡنٍۭ بِاِذۡنِ رَبِّہَا ؕ

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو ایک پاکیزہ درخت سے تشبیہ دی جس کی جڑیں پائیدار اور شاخیں آسمان میں ہیں اور وہ اپنے رب کے حکم سے ہر موسم میں پھل دیتا ہے۔'' (ابراہیم: ۲۴،۲۵)

ظاہر سی بات ہے کہ جس درخت کی جڑیں انسان کے قلب کی گہرائیوں میں اور اس کی شاخیں انسان کے سارے وجود اور تمام اعضاء میں پھیلی ہوئی ہوں، وہ ایسا پھلدار درخت ہوگا جس پر کوئی خزاں نہیں آسکتی اور نہ ہی کوئی طوفان اسے اکھیڑ سکتا ہے۔

سورۂ والعصر میں یہی بات ایک اور انداز میں کہی گئی ہے۔ اس صورت میں تمام انسانوں کو خسارے اور نقصان میں بتایا گیا ہے اور صرف ان لوگوں کو مستثنٰی کیا گیا ہے جو سب سے پہلے ایمان رکھتے ہیں، پھر عمل صالح کرتے ہیں، حق کی حفاظت کرتے ہیں اور صبر واستقامت کی تلقین کرتے ہیں۔

وَالۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ٪﴿۳﴾

یہ بات ایک اور دلچسپ انداز میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَرَحۡمَتُہٗ مَا زَکٰی مِنۡکُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰکِنَّ اللّٰہَ یُزَکِّیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ

''اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتے تو تم میں سے کوئی بھی تزکیہ نہ کرسکتا لیکن اللہ جسے چاہتا ہے (اور قابل سمجھتا ہے) اس کا تزکیہ کرتا ہے۔'' (نور: ۲۱)

بنابرایں انسان کے اخلاق وعمل کی پاکیزگی اور مکمل تزکیہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی رحمت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہی بات سورہ اعلیٰ میں ان الفاظ میں بیان کی گئی:

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی ﴿۱۴﴾ وَذَکَرَ اسۡمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی ﴿۱۵﴾

''یقیناوہ شخص فلاح پا گیا جس نے تزکیہ کیا، اپنے رب کے نام کو یاد کیا اور نماز ادا کی۔'' (اعلیٰ: ۱۴،۱۵)

ان آیات کے مطابق اخلاق وعمل کا تزکیہ اللہ کے ذکر اور نماز سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اگر تزکیہ کا عمل ذکر خدا اور نماز سے

سیراب ہوتا رہے تو وہ پائیدار رہتا ہے اور اگر کسی اور بنیاد پر استوار ہو تو سست اور کمزور ہوتا ہے۔

ایک اور مقام پر تقویٰ اور اخلاقی عمل کے ایمان کے ساتھ مضبوط تعلق کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے:

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۹۳

''جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیتے رہے، ان پر اس بارے میں کوئی گناہ نہیں ہے جو انہوں نے کھایا، اگر وہ تقویٰ اختیار کریں، ایمان لائیں اور عمل صالح انجام دیں۔ پھر تقویٰ اختیار کریں اور ایمان لائیں، پھر تقویٰ اختیار کریں اور نیکی کریں اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

''(مائدہ:۹۳)

اس آیت میں کبھی تقویٰ کو ایمان اور عمل صالح پر مقدم رکھا گیا اور کبھی ان کے بعد اور کبھی نیکی پر مقدم رکھا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مرحلہ ایسا ہوتا ہے جہاں اخلاقی اور عملی تقویٰ ایمان سے پہلے ہوتا ہے۔ یہ تقویٰ قبولیت ایمان کی آمادگی اور جستجوئے ایمان کی ذمہ داری کے احساس کا دوسرا نام ہے۔

اس کے بعد جب انسان حق کو پہچان کر اس پر ایمان لے آتا ہے تو تقویٰ کا ایک اعلیٰ درجہ اس کے وجود پر سایہ فگن ہو جاتا ہے اور مختلف اقسام کی نیکیوں کے انجام دینے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس طرح ایمان اور تقویٰ کے درمیان بہت قریبی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ اخلاص کی مضبوط ترین اور اعلیٰ ترین بنیاد اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی بارگاہ میں احساس ذمہ داری ہے۔ ایمان جو مادی مسائل سے بہت بالاتر ہے اور اس کا کسی بھی چیز سے مبادلہ نہیں کیا جا سکتا، ہر وقت اور ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی بھی اس سے جدا نہیں ہوتا، ہر چیز اس کے مقابلہ میں ناچیز اور حقیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخلاق کا اعلیٰ ترین نمونہ جس میں قربانی و ایثار کی اعلیٰ ترین مثالیں نظر آتی ہیں، اولیاء اللہ کی زندگی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

نیز یہی وجہ ہے کہ مادی معاشروں میں جہاں ہر چیز کو مادی اور ذاتی منفعت کی بنیاد پر پرکھا جاتا ہے، اخلاقی مسائل بہت کمزور دکھائی دیتے ہیں اور زیادہ تر وہیں نظر آتے ہیں جہاں مفادات کا عمل دخل ہوتا ہے۔ خوش اخلاقی، ادب، ایمانداری، وفا، سخاوت اور دیگر تمام اخلاقی اقدار صرف اس وقت تک محترم ہوتی ہیں جب وہ مادی مفادات کے حصول میں مفید ثابت ہوں۔ جہاں مادی مفادات خطرے میں پڑ جائیں، وہاں یہ اخلاقی اقدار بھی غیر موثر ہو جاتی ہیں۔

ماں باپ جو بڑھاپے میں مفید نہیں رہتے، فراموش کر دیئے جاتے ہیں۔ انہیں بوڑھوں کے ہوسٹل میں داخل کر کے ان کے مرنے کا انتظار کیا جاتا ہے۔

بچے جیسے ہی کام کرنے کے قابل ہوتے ہیں، گھر سے باہر نکال دیئے جاتے ہیں۔اس لئے نہیں کہ معاشی لحاظ سے خود کفیل ہوجائیں بلکہ اس لئے کہ ہمیشہ کے لیے فراموش ہوجائیں۔

شریک حیات سے محبت بھی اس وقت تک باقی رہتی ہے جب وہ مادی فائدہ اور لذت پہنچانے کے قابل ہو، ورنہ وہ بھی فراموش کردی جاتی ہے۔اسی وجہ سے ان ممالک میں طلاق کی شرح خوفناک حد تک زیادہ ہے۔

مادی مکاتب فکر، جہاں اخلاق کی کوئی الٰہی بنیاد نہیں ہوتی، وہاں اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے شوقِ شہادت ایک بے معنی چیز ہوتی ہے۔ان معاشروں میں ایک حد سے زیادہ سخاوت کو دیوانگی سمجھا جاتا ہے۔عفت اور پاکدامنی کو نااہلی، زہد اور دنیوی لذتوں سے بے رغبتی کو سادہ لوحی قرار دیا جاتا ہے۔

ان ممالک سے رونما ہونے والی طاقتیں اور ان کے حکمرانوں کی زندگی اس اخلاق کا بہترین نمونہ ہیں۔ان ترقی یافتہ اور طاقتور ممالک کا انسانی حقوق کے معاملے میں دوہرا معیار کس قدر وحشت انگیز ہے، جہاں انسانی حقوق ان کے مفادات کے لیے ذرا بھی نقصان دہ ہوں، وہ انہیں مکمل طور پر نظر انداز کردیتے ہیں اور اس اعلیٰ اخلاقی حقیقت کو اپنے مفادات پر قربان کردیتے ہیں۔

خطرناک ترین اور انسانی حقوق کے خلاف بڑے بڑے جرائم پیشہ افراد یہاں پر پسندیدہ اور ہر دلعزیز نظر آنے لگتے ہیں۔اس کے برعکس پاکیزہ سیرت و کردار کے افراد جو حقوق انسانی کی حفاظت کے لیے میدان عمل میں اتر آتے ہیں لیکن ان کے کچھ مادی مفادات کے لیے خطرناک ہوتے ہیں، وہ انہیں ایسے شیاطین قرار دینے لگتے ہیں جنہیں ہر لحاظ سے کچلنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ایک ہی وقت میں دنیا کے ایک حصہ میں جمہوریت اور عوامی حاکمیت کے زبردست حامی نظر آتے ہیں تو دنیا کے کسی اور حصہ میں بدترین آمریت کی حمایت کررہے ہوتے ہیں۔اس کی بنیادی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے نزدیک بنیادی اہمیت ان کے اپنے مادی مفادات کی ہوتی ہے۔اس کے علاوہ ان کے پاس اخلاق کی کوئی واضح بنیاد نہیں ہوتی۔

یہاں پر ایک نکتہ بھی قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ مادی مفادات کو سب کچھ سمجھنے والے یہ افراد صرف اپنے زمان و مکان پر نظر رکھتے ہیں۔انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ گزشتہ لوگوں نے کیا کیا اور آنے والے لوگ کیا کریں گے۔ہاں! اگر ان باتوں کا کسی حد تک ان کی موجودہ زندگی سے کوئی تعلق ہو تو اس حد تک وہ اسے اہمیت بھی دیتے ہیں، ورنہ ان کی منطق یہ ہوتی ہے کہ جب ہم نہ ہوں گے تو دنیا کو سیلاب بہالے جائے یا باقی رہے، ہمیں اس سے کیا سروکار!

لیکن جو خدا پرست ہوتے ہیں، وہ حیات بعد از موت کے عقیدہ کی بنیاد پر اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عدل میں حاضری کے احساس کی وجہ سے اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر کوئی نیکی دنیا میں چھوڑ جائیں گے جو ضرورت مند انسانوں کے کام آتی رہے گی تو اس کی برکتیں اگلے جہان میں بھی انہیں ملتی رہیں گی۔اس طرح ایسے افراد صرف اپنی زندگی میں ہی نہیں بلکہ ہزاروں سال کے بعد بھی انسانوں کے لیے مفید ہوتے ہیں۔

ایک مشہور حدیث نبویؐ ہے کہ:

اذامات المؤمن انقطع عمله الا من ثلاث: صدقة جارية، اوعلم ينتفع به اوولد صالح يدعوله

''جب مومن مر جاتا ہے تو اس کا عمل رک جاتا ہے، سوائے ان تین چیزوں کے: صدقۂ جاریہ، وہ علم جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا رہے اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعائے خیر کرتی رہے۔''

(بحارالانوار، ۲:۲۲)

اس طرح آخرت پر ایمان صدقۂ جاریہ، مفید علمی خدمات اور نیک اولاد کی تربیت جیسے عظیم اخلاقی کاموں کا سبب بنتا ہے جبکہ مادہ پرستوں کے یہاں ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

آیت اللہ مرتضیٰ مطہری شہید اپنی کتاب ''فلسفہ اخلاق'' میں خود پسندی کو تین اقسام میں تقسیم کرتے ہیں:

ذاتی خود پسندی، خاندانی خود پسندی اور قومی خود پسندی۔ اس کے بعد وہ ان تینوں کو اخلاق کے خلاف قرار دے کر مشہور فرانسیسی مفکر گوسٹاولوبون کی کتاب ''تمدنِ اسلام عرب'' سے اس کے ایک بیان کا خلاصہ بیان فرماتے ہیں جس کا ذکر یہاں پر مفید معلوم ہوتا ہے:

گوسٹاولوبون اس بارے میں کہ اہل مشرق مغربی ثقافت کا اس طرح استقبال کیوں نہیں کرتے جیسے انہیں کرنا چاہئے، چند وجوہات کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ وہ ایسا کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کا طرزِ زندگی ہمارے طرزِ زندگی سے مختلف ہے۔ ان کی زندگی سادہ ہے جبکہ ہم نے اپنی زندگی کی مصنوعی ضروریات بنا رکھی ہیں۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ہم اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اہل مغرب نے ان کے بارے میں جو ظالمانہ رویہ اختیار کیا، وہ اس سلسلہ کا سب سے اہم سبب ہے۔

اس کے بعد وہ ان مظالم کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اہل مغرب نے امریکہ، چین اور ہندوستان میں کئے۔ اس سلسلہ میں وہ خاص طور پر ''افیون کی جنگ'' کا ذکر کرتا ہے۔ اس سے مراد انگریزوں کی وہ چال ہے کہ انہوں نے چینیوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے انہیں افیون کا عادی بنا دیا تا کہ ان کی مزاحمت کو توڑا جا سکے۔ چینی ان کی اس چال کو سمجھ گئے اور مقابلہ پر ڈٹ گئے۔ آخر کار انگریز توپ اور بندوق کے ذریعے ان پر مسلط ہو گئے اور افیون کو ان میں رواج دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں چین میں سالانہ چھ لاکھ افراد افیون کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے تھے۔

جب اخلاق کی بنیاد ایمان اور معنوی اقدار پر نہ رکھی جائے تو جہاں اخلاق اور مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہوگا، وہاں اخلاق پسپا ہو جائے گا۔

اہم نکتہ

جو کچھ ہم نے اس بارے میں کہا کہ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان، اخلاق کی مضبوط بنیاد ہے۔اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اخلاقیات کو گہرائی بخشنے میں ہم ''عقل فطری'' کے کردار کا انکار کر رہے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کا ضمیر انسان کے اندر اللہ کا نمائندہ ہے اور اخلاقی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں موثر کردار ادا کرتا ہے۔لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایمان کی طاقت سے بھی بہرہ مند ہو اور خود پرستی اور ہوائے نفس کی قید سے آزاد ہو۔

قرآن مجید میں بار بار اس مسئلہ پر زور دیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ﴿۱۰۰﴾

''اور اللہ ان لوگوں پر رجس قرار دے دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔''(یونس:۱۰۰)

اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے:

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ﴿۲۲﴾

''اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے اور گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے (یعنی حق بات کو سنتے ہیں نہ حق بات کہتے ہیں)۔''(انفال:۲۲)

جو لوگ نماز کا مذاق اڑاتے ہیں، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ﴿۵۸﴾

''اور جب تم نماز کے لیے اعلان کرتے ہو تو وہ لوگ اس کے ساتھ ہنسی مذاق اور کھیل کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔''(سورہ مائدہ آیت ۵۸)

مندرجہ بالا تشریحات کی روشنی میں اخلاقیات سے متعلق قرآنی نکتہ نظر کا خلاصہ واضح ہو جاتا ہے۔

پانچواں باب

اخلاق اور آزادی

اس سوال پر بہت بحث وتمحیص ہوتی رہی ہے کہ کیا اخلاق انسان کی آزادی کو محدود کر دیتا ہے اور یہ کہ یہ محدودیت انسان کے لیے مفید ہے یا مضر؟ ہمارا خیال یہ ہے کہ ان بحثوں کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ آزادی کے مفہوم کو درست طرح سے نہیں سمجھا گیا۔ اس سلسلہ میں مختلف باتیں کہی جاتی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ اخلاق انسان کو محدود کر دیتا ہے، لہٰذا اس کی استعداد وصلاحیت پروان نہیں چڑھ سکتی۔

۲۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اخلاق انسان کی فطری خواہشات کی سرکوبی کرتا ہے تاکہ انسان حقیقی کمال تک پہنچ سکے، حالانکہ اگر یہ خواہشات غیر ضروری ہوتیں تو اللہ تعالیٰ انہیں پیدا کیوں کرتا۔

۳۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اخلاق لذت پسندی کے خلاف ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کی خلقت کا مقصد ہی حصولِ لذت ہے۔

۴۔ بعض اوقات اس کے برعکس یہ کہا جاتا ہے۔ انسان فطری طور پر غیر آزاد ہے اور ہمیشہ جبر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، لہٰذا اخلاقی پند ونصیحت کی نوبت ہی نہیں آسکتی۔

۵۔ بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ دینی اخلاق کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر رکھی جاتی ہے جو کہ بذاتِ خود خوف یا طمع کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہ دونوں ہی غیر اخلاقی ہیں۔

انسان کی متضاد قسم کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نہ تو آزادی کے مفہوم کو صحیح طرح سے سمجھا گیا ہے اور نہ ہی دینی اخلاق، خصوصاً اسلامی اخلاق اور اس کی بنیادوں کے بارے میں صحیح غور وفکر کیا گیا ہے۔

اسی وجہ سے ہم سب سے پہلے آزادی کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

انسان کیوں اپنے وجود کی گہرائی سے آزادی کا خواہاں ہے؟ انسان کیوں آزاد ہو؟ انسان کے جسم اور روح کی پرورش میں آزادی کا کیا کردار ہے؟ مختصر یہ کہ آزادی کا فلسفہ کیا ہے؟

ان تمام سوالات کا مختصر جواب یہ ہے کہ انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں اور خصوصیات پنہاں ہیں جو آزادی کے بغیر نشوونما نہیں پاسکتی ہیں۔ چونکہ انسان ان صلاحیتوں کی پرورش اور نشوونما کا خواہش مند ہے، لہٰذا وہ آزادی کا بھی خواہاں ہے۔ اس لیے کہ آزادی اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آزادی جو ان تخلیقی صلاحیتوں کی پرورش کے لیے ضروری ہے، ہر قسم کی قید وشرط سے آزاد

آزادی ہے یا محدود اور مشروط آزادی ہے؟

اس بات کو ایک دو مثالوں کے ذریعے واضح کیا جا سکتا ہے۔

ایک باغبان کی مثال پر غور کریں جو مختلف قسم کے پھلوں اور پھولوں کی پرورش کے لیے بیج بوتا ہے اور بروقت پانی دیتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ اگر یہ درخت اور پودے آزاد فضا میں نہ ہوں، انہیں سورج کی گرمی اور روشنی اور بارش سے استفادہ کرنے کا موقع نہ ملے، یا اس کی جڑیں کسی پتھر سے ٹکرا کر زمین کے اندر گہرائی تک نہ جا سکیں تو باغبان کو کوئی پھل یا پھول حاصل نہ ہوگا۔ نتیجہ یہ کہ درخت کے پھلدار ہونے کے لیے جڑوں، تنے اور شاخوں کی آزادی ضروری ہے۔

لیکن بعض اوقات یہ بھی ممکن ہے کہ کسی درخت میں غیر ضروری شاخیں پیدا ہو جائیں یا درخت اپنے اصل راستے سے بھٹک جائے یا ٹیڑھا ہو جائے۔ ایسی صورت میں باغبان اپنا مخصوص قینچہ اٹھا کر نہایت بے رحمی سے غیر ضروری شاخوں کو کاٹنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ کوئی عقلمند اس باغبان پر اعتراض نہیں کر سکتا کہ اس نے درخت کی شاخوں کو کیوں آزادی سے بڑھنے نہیں دیا۔

اسی طرح وہ ٹیڑھے تنے کو ایک سیدھی اور مضبوط لکڑی سے باندھ دیتا ہے تا کہ وہ اپنی صحیح سمت کی طرف بڑھ سکے۔ یہاں بھی کوئی عقلمند اس پر یہ اعتراض نہیں کر سکتا کہ اس نے درخت کو کیوں پا زنجیر کر دیا اور کیوں اس کی آزادی کو محدود کر دیا۔ اس لیے کہ ایسے ہر اعتراض کے جواب میں باغبان یہ کہے گا کہ درخت کے پھل دینے کے لیے اس کی آزادی ضروری ہے لیکن اس مقصد سے بھٹکنے کی آزادی نہیں دی جا سکتی۔

انسان کے بارے میں بھی یہ بات پوری طرح صادق آتی ہے۔ اس میں بھی بے پناہ غیر معمولی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ اسے اس مقصد تک پہنچنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کی آزادی ہے لیکن اسے یہ آزادی ہرگز نہیں دی جا سکتی کہ وہ ان صلاحیتوں کو تباہ کر دے۔

جو لوگ آزادی سے ہر قسم کی مادر پدر آزاد، آزادی مراد لیتے ہیں، انہوں نے آزادی کے معنی کو نہیں سمجھا ہے۔ آزادی کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ انسان اعلیٰ ترین مادی یا معنوی مقاصد کے حصول کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں آزاد ہو۔

اس سلسلہ میں ایک اور مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ انسان اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے سڑک پر چلنے میں آزاد ہے۔ لیکن اس آزادی کے یہ معنی ہرگز نہیں لیے جا سکتے کہ انسان ٹریفک کے قوانین کی پابندی نہ کرے۔ کوئی عقلمند انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ چوراہے پر سرخ بتی دیکھ کر رکنا اور ٹریفک کے دوسرے قوانین کی پابندی کرنا گاڑی چلانے کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا کہے تو سب اس پر ہنسیں گے اور اسے کہیں گے کہ آزادی کو کسی قانون کا پابند ہونا چاہئے تا کہ انسان اپنے مقصد تک پہنچ سکے، نہ یہ کہ اموال اور صلاحیتیں ضائع ہوں، جانوں کا نقصان ہو اور انسان اپنے مقصد تک نہ پہنچ پائے۔

حقیقت یہ ہے کہ بہت سی آزادیاں جھوٹی آزادیاں ہیں اور درحقیقت امارت اور غلامی ہیں۔ جو جوان اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتے ہوئے منشیات کا عادی ہو جاتا ہے، درحقیقت وہ قید میں ہے۔ وہ آزادی جو اخلاقی قوانین کے ساتھ ہم آہنگ ہو، وہی

حقیقی آزادی ہے جو انسان کو ہوائے نفس کی قید سے آزادی دلاتی ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان کس قدر معنویت کا حامل ہے:

ان تقوی الله مفتاح سداد، و ذخیرة معاد، و عتق من کل ملکة، و نجاة من کل هلکة

''تقویٰ بند دروازہ کی چابی، آخرت کا ذخیرہ، ہر قسم کی غلامی سے آزادی اور ہر قسم کی ہلاکت سے نجات ہے۔'' (نہج البلاغہ: خطبہ ۳۲۰)

مندرجہ بالا تجزیہ اور مثالوں سے حقیقی آزادی اور جھوٹی آزادی کا فرق واضح ہو جاتا ہے جس کی مدد سے آزادی جیسی مقدس حقیقت کے غلط استعمال کو روکا جا سکتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اخلاق فطری خواہشات کو کچل دیتا ہے اور اگر فطری خواہشات غیر ضروری ہوتیں تو اللہ انہیں پیدا کیوں کرتا!

انسان کی فطری خواہشات درحقیقت بارش کے ان حیات بخش قطروں کی مانند ہیں جو آسمان سے برستے ہیں۔ بلاشبہ اگر یہ غیر ضروری ہوتے تو اللہ تعالیٰ انہیں نازل نہ کرتا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم قطروں کو اس بات کی اجازت دیں کہ وہ اکٹھے ہو کر تباہ کن سیلاب کی شکل اختیار کر لیں۔ عقل یہ کہتی ہے کہ ایسے پانی کو ڈیم بنا کر روک لیا جائے اور اس الٰہی نعمت کو ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے ذریعے زراعت کی ترقی کے لیے بروئے کار لایا جائے۔ انسان کی فطری خواہشات بھی بارش کے قطروں کی مانند ہیں۔ اگر انہیں کسی منصوبہ بندی کے تحت مثبت اور تعمیری مقاصد کے لیے استعمال نہ کیا جائے تو وہ ایک تباہ کن سیلاب کی طرح انسان کی ہر چیز کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیں گے۔

مندرجہ بالا بحث سے بہت واضح طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اخلاق انسان کو محدود کرتا ہے نہ اس کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بنتا ہے اور نہ ہی فطری خواہشات کو کچلتا ہے۔ اخلاق کا کام یہ ہے کہ آزادی کو سعادت کی راہ میں بروئے کار لائے اور فطری خواہشات کو کمال مطلوب تک پہنچنے میں رہنمائی فراہم کرے۔

آزادی کی اس تشریح سے، جو ہمارے خیال میں آزادی کی صحیح تشریح ہے، اخلاق کے مخالفین کے بہت سے اعتراضات کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور مزید کسی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

عقیدۂ جبر اور غیر اخلاقی مسائل

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انسانی ارادہ کی آزادی، ایمان اور اخلاقیات کا آپس میں گہرا تعلق ہے، اس لئے کہ، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اگر انسان کی آزادی کی نفی ہو جائے تو تمام اخلاقی مفاہیم کی عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ادیانِ الٰہی جو انسان کی تہذیب نفس اور اخلاقی تربیت کے فریضہ کو انجام دیتے ہیں، انسانی آزادی کے زبردست حامی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ان آیات سے بھرا پڑا ہے جو انسانی ارادے کی آزادی کو ثابت اور جبر کی نفی کرتی ہیں۔ اس قسم کی آیات سینکڑوں کی تعداد میں ہیں اور جبر و اختیار کے بارے میں ان پر بحث کی گئی ہے۔

بنیادی طور پر امر و نہی، نیکی اور اطاعت کی دعوت اور اللہ کی نافرمانی سے رکنے کا حکم، سزا و جزا، اللہ کی عدالت، قوانین کا نفاذ اور حدود الٰہی کا نفاذ، سب انسانی ارادے کی آزادی پر دلالت کرتے ہیں۔

اگر قرآن مجید میں ایسی آیات موجود ہیں جن سے جبر کے قائلین اپنے نظریہ کے حق میں استدلال کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان آیات کے حقیقی اور صحیح مفہوم کو سمجھا نہیں گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ آیات تفویض کی نفی کرتی ہیں مگر ان سے جبر کا اثبات نہیں ہوتا۔

عقیدۂ جبر ہر قسم کی غیر اخلاقی روش اختیار کرنے کا ایک اہم سبب ہو سکتا ہے۔ ہر گناہگار انسان اس بات کو بہانہ بنا کر کہ اس کی قسمت کا فیصلہ روزِ اول سے یہی کر دیا گیا ہے اور یہ کہ وہ اس الٰہی فیصلہ کے خلاف نہیں جا سکتا، گناہ اور بدکاری کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے تاریخ میں بھی اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ بہت سے گناہگار انسان اسی عقیدہ کی بنیاد پر اپنے گناہوں کا جواز پیش کرتے ہوئے اپنے آپ کو معذور گردانتے تھے۔ ان کا طرزِ استدلال یہ تھا کہ ہم اچھے یا برے، اس میں ہمارا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے، کاتب تقدیر نے روزِ اول سے ہماری تقدیر ہی ایسی بنا دی ہے۔ لہٰذا نہ نیک لوگوں کو اپنی نیکی پر فخر کرنا چاہئے اور نہ ہی برے لوگوں کو ان کی برائی پر سرزنش کی جانی چاہئے۔

اسی بنیاد پر تمام انبیاء علیہم السلام خصوصاً رسولؐ اسلام نے اخلاقیات کی بنیادوں کی مضبوطی اور تزکیہ نفس کے لیے سب سے پہلے انسانی ارادے کی آزادی کا اثبات کیا۔

بہر حال جبر و اختیار، قضا و قدر، ہدایت و ضلالت، سعادت و شقاوت اور ان جیسے دیگر مسائل مستقل اور مفصل موضوعات ہیں۔ مستقبل میں تفسیر موضوعی کے مباحث میں ہم انہیں زیر بحث لائیں گے۔ یہاں ہمارے پیش نظر صرف اس مسئلہ کی نشاندہی کرنا اور اخلاقی مسائل پر اس کے اثرات کی طرف اشارہ کرنا تھا۔

جولوگ حصولِ لذت کو ہی زندگی کا اصل مقصد سمجھتے ہوئے اخلاقیات کو اس کے منافی قرار دیتے ہیں[1]، وہ اس نکتہ سے غافل ہیں کہ اگر ہم لذت کو صرف مادی لذت میں محدود کر دیں اور روحانی لذتوں کو نظر انداز کر دیں، تب بھی اخلاقی اصولوں کی پابندی کے بغیر مادی لذت کا حصول ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بے قید و شرط لذت طلبی کا نتیجہ بہت دردناک ہوتا ہے۔ لہٰذا ان دردناک نتائج سے محفوظ رہنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ بہت سی نقد لذتوں کو ترک کر دیا جائے۔

یہ نکتہ نظر پیش کرنے والے اگرچہ گزشتہ دور کے فلاسفہ میں شمار ہوتے ہیں مگر ان کی یہ بات منشیات کے عادی اس شخص کی بات کی مانند ہے جسے یہ کہا جائے کہ تمہارا آج کا نشہ مستقبل میں تمہارے لیے بہت برے نتائج لے کر آئے گا تو وہ جواب دیتا ہے کہ موجودہ لمحہ کو غنیمت جانو، آج عیاشی کر لو، کل کس نے دیکھا ہے۔

لیکن جب قلبی، اعصابی اور دماغی امراض منشیات کے استعمال کے نتیجہ میں اس پر حملہ آور ہوتے ہیں تو وہ اپنی اس منطق پر حسرت و افسوس کا اظہار کرتا ہے لیکن اس وقت بدقسمتی سے عموماً واپسی کا راستہ بند ہو چکا ہوتا ہے۔

عفت، امانت، صداقت اور جوانمردی جیسی اقدار کے بارے میں اخلاقی نصائح کی یہی حیثیت ہے۔ جس معاشرہ میں خیانت اور بدعنوانی عام ہو جائے، اس معاشرہ کے لوگوں کو کونسی لذت میسر آ سکتی ہے۔ بخل جیسی صفت جس معاشرہ پر حاکم ہو اور ہر شخص اپنی ذات کے لیے لذت کی جستجو کر رہا ہو، اس معاشرے کے لوگ مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ اس معاشرہ کا ہر فرد تنہا ہوتا ہے اور مشکلات کا تنہا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جس معاشرہ میں سخاوت عام ہو، وہاں اگر ایک شخص کسی حادثہ کا شکار ہو جائے تو سب اس کی خبر گیری کرتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں کوئی تنہا نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی مشکلات کے سامنے عاجز و ناتواں ہوتا ہے۔

یہ وہی بات ہے جس کی طرف ہم قرآن شریف اور احادیث کی روشنی میں اشارہ کر چکے ہیں کہ تمام اخلاقی صفات کے دو اثر ہوتے ہیں، ایک معنوی اور دوسرا مادی۔ اگر اس کے معنوی اثر کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس کے مادی فوائد ہی اس قدر وسیع ہیں کہ سب لوگوں پر ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ان اخلاقی اصولوں کو اپنا لیں تاکہ یہ دنیا ایک جنت بن جائے جس میں سب لذت میں ڈوبے ہوئے ہوں اور اخلاقی برائیوں کے نتیجہ میں رونما ہونے والے جہنم سے محفوظ ہوں۔

آخر میں ان لوگوں کے نکتہ نظر کا جائزہ لیتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ دینی اخلاق اللہ کی اطاعت پر مبنی ہے اور اللہ کی اطاعت خوف اور طمع پر مبنی ہے جو کہ بذات خود غیر اخلاقی صفات ہیں۔

اس نکتہ نظر پر دو پہلوؤں سے تنقید کی جا سکتی ہے۔

خوف اور طمع کی اصطلاح کا استعمال یہاں پر درست نہیں ہے۔ اس کی بجائے یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ کچھ لوگ اخروی

---

[1] اس مکتبہ فکر کا ایک معروف علمبردار آر لیسٹیپ ہے جو زمانہ قبل از مسیح میں رہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ خیر سے مراد لذت ہے، شر سے مراد رنج و الم ہے۔ انسان کا حقیقی مقصد زندگی دنیوی لذتوں سے لطف اندوز ہونا ہے اور انسان کو اس کے اچھے یا برے نتائج کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ (علم اخلاق یا حکمت عملی: ۲۴۳)

سعادت کے حصول اور عدل الٰہی کی میزان سے سزا سے بچنے کی خاطر اعلیٰ اخلاقی اقدار کو اپناتے ہیں اور یہ بات ہرگز غیر اخلاقی نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ فانی زندگی کی عارضی لذتوں کو ابدی زندگی پر قربان کر دیتے ہیں اور بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے سے فائدے کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اگر کوئی شخص خیانت اور جھوٹ کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی ذلت و رسوائی سے بچنے کی خاطر ان دو برائیوں سے پرہیز کرتا ہو تو کیا اس کا یہ عمل غیر اخلاقی کہلائے گا؟ اگر کوئی شخص اپنی صحت و سلامتی کے پیش نظر شراب خوری سے اجتناب کرتا ہو اور منشیات سے دور رہتا ہو تو کیا اس کا یہ عمل غیر اخلاقی کہلائے گا؟ اسی طرح اگر کوئی شخص لوگوں سے ادب، تواضع اور محبت کے ساتھ پیش آتا ہو تا کہ لوگ اس سے دور نہ جائیں اور وہ زندگی میں تنہا نہ رہ جائے تو کیا اسے غیر اخلاقی عمل کہا جائے گا؟

مختصر یہ کہ ہر اخلاقی عمل کے مادی فوائد بھی ہوتے ہیں۔ ان فوائد کے حصول کی کوشش کو طمع کہنا مناسب نہیں ہے۔ اسی طرح غیر اخلاقی اعمال کے نتیجہ میں رونما ہونے والے مضر اثرات سے بچنے کو خوف اور بزدلی جیسی غیر اخلاقی صفات نہیں کہنا چاہیے۔

چھٹا باب

قرآن مجید میں اخلاق کے بنیادی اصول

اس بحث کا آغاز کرنے سے قبل ضروری ہے کہ ہم دوسرے مکاتب فکر میں اخلاق کے بنیادی اصولوں پر ایک نظر ڈالیں۔

زمانہ قدیم کے فلاسفہ کا ایک گروہ جنہیں علم اخلاق کے بانی قرار دیا جاتا ہے، اخلاق کے چار بنیادی اصولوں کے قائل تھے۔ بالفاظِ دیگر انہوں نے تمام اخلاقی فضائل کو ان چار چیزوں میں سمیٹ دیا تھا:

۱۔حکمت ۲۔عفت ۳۔شجاعت ۴۔عدالت

کبھی کبھار وہ ان میں خدا پرستی کا اضافہ بھی کر دیتے تھے۔اس طرح مجموعی طور پر اخلاق کے بنیادی اصولوں کی تعداد پانچ ہو جاتی تھی۔

اس مکتبہ فکر کا بانی سقراط کو قرار دیا جاسکتا ہے۔اس کا عقیدہ یہ تھا کہ:

''نیکی اور اخلاق کا دارومدار نیک و بد کی پہچان (یعنی دانائی) پر ہے اور علم و دانش ''حکمت'' کے علاوہ کوئی فضیلت مطلق نہیں ہے۔ جب علم کا تعلق اس بات سے ہو کہ انسان کو کن چیزوں سے ڈرنا چاہئے اور کن چیزوں سے نہیں ڈرنا چاہیے تو اس دانائی کو ''شجاعت'' کہتے ہیں۔ جب اس کا تعلق انسان کی نفسانی خواہشات سے قائم ہو جائے تو اسے ''عفت'' کہا جاتا ہے۔ جب اس کا تعلق انسانوں پر حکم اور قوانین سے قائم ہو جائے تو اسے عدالت کہتے ہیں۔ اگر انسان کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کے حوالہ سے اس کی ذمہ داریوں پر غور کیا جائے تو یہ ''خدا پرستی'' اور ''دینداری'' ہے۔ یہ پانچ فضائل یعنی حکمت، شجاعت، عفت، عدالت اور خدا پرستی سقراط کے مکتبہ فکر میں اخلاق کے بنیادی اصول ہیں۔'' (سیر حکمت در اروپا، ۱:۱۸)

بہت سے مسلمان علماء جنہوں نے علم اخلاق پر کتب لکھی ہیں یا اس سلسلہ میں بحث کی ہے، نہ صرف ان چار یا پانچ اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ انہوں نے اس میں مزید تحقیق اور موشگافی کر کے ان کی بنیاد کو اور بھی پختہ کیا ہے اور انہیں اپنی اخلاقی بحث کی بنیاد قرار دیا ہے۔

وہ اس بارے میں اپنے نکتہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کے نفس اور روح میں تین قوتیں پائی جاتی ہیں:

۱۔ قوۂ ادراک یعنی حقائق کو پہچاننے والی قوت۔

۲۔ قوۂ جاذبہ یعنی یہ وہ قوت ہے جو حصولِ منافع کے لیے سرگرم عمل رہتی ہے جسے دوسرے الفاظ میں ''شہوت'' کہا جاتا ہے۔ (البتہ اس سے مراد صرف جنسی شہوت نہیں ہے بلکہ انسان کی ہر قسم کی خواہشات اس کے زمرے میں آجاتی ہیں)۔

۳۔ قوۂ دافعہ یعنی یہ وہ قوت ہے جو نقصانات اور خطرات کو دور کرنے کی ذمہ دار ہے۔ اس قوت کو دوسرے الفاظ میں

''غضب'' کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد وہ ان تینوں قوتوں کے اعتدال کو اخلاقی فضائل شمار کرتے ہیں جو بالترتیب حکمت، عفت اور شجاعت کہلاتے ہیں۔

اس کے بعد وہ مزید کہتے ہیں کہ جب شہوت اور غضب قوۂ عقل کے تابع ہوں تو جو کیفیت انسان کی ہو جاتی ہے، اسے ''عدالت'' کہا جاتا ہے جو کہ چوتھا اخلاقی اصول ہے۔

بالفاظ دیگر مذکورہ بالا تینوں قوتوں میں ہر ایک کا نکتہ اعتدال پر ہونا بذاتِ خود فضیلت ہے جن کا نام حکمت، عفت اور شجاعت ہے جبکہ ان سب کا اس طرح جمع ہو جانا کہ شہوت اور غضب قوۂ ادراک کے تابع ہو جائیں تو یہ ایک اور فضیلت ہے جسے عدالت کہتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی انسان میں شجاعت پائی جاتی ہے مگر اس کا مناسب موقع پر استعمال نہیں ہوتا۔(مثلاً ان کی شجاعت بیہودہ جنگوں میں استعمال ہوتی ہے)۔ایسی صورت میں شجاعت تو موجود ہوتی ہے لیکن عدالت موجود نہیں ہوتی۔لیکن اگر یہ فضیلت جسے شجاعت کہتے ہیں، کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے بروئے کار لائی جائے، یعنی یہ حکمت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو عدالت معرضِ وجود میں آتی ہیں۔

اس طرح مسلم مفکرین کا یہ گروہ انسان کے تمام اخلاقی فضائل کو ان چار بنیادی فضائل کے تابع قرار دیتا ہے۔ان کا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی بھی اخلاقی فضیلت ایسی نہیں ہے جو ان چار فضائل میں سے کسی ایک کی شاخ نہ ہو۔اس کے برعکس تمام اخلاقی رذائل انہی چار فضائل اخلاقی سے افراط وتفریط کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مزید وضاحت کے لیے ''احیاء العلوم''، ''محجۃ البیضاء'' اور دیگر معروف کتب اخلاق کی طرف رجوع فرمائیں۔

تنقید و تحقیق

اخلاقی فضائل کو مذکورہ بالا چار بنیادی فضائل میں تقسیم کرنے کی کوئی مسلمہ اسلامی بنیاد اور اساس نظر نہیں آتی بلکہ یہ ان تحقیقات کا نتیجہ ہے جو مسلم مفکرین نے حکمائے یونان کے نظریات پر کی ہیں اور ان کے نقائص کو برطرف کر کے انہیں مکمل کیا ہے۔ اگرچہ بعض روایات میں بھی ان کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، مثلاً حضرت علی علیہ السلام سے منسوب ایک روایت میں آتا ہے:

الفضائل اربعة اجناس: احدها الحكمة و قوا مها فى الفكرة، و الثانى العفة وقوامها فى الشهوة، و الثالث القوة و قوامها فى الغضب، و الرابع العدل و قوامه فى اعتدال قوى النفس

''فضائل کی چار اقسام ہیں، ان میں سے ایک حکمت ہے جس کی جڑیں غور وفکر میں ہیں، دوسری عفت

ہے جس کی جڑیں شہوت میں ہیں، تیسری قوت ہے جس کی جڑیں غضب میں ہیں، چوتھی عدالت ہے جس کی بنیاد تمام قوائے نفسانی کا اعتدال ہے۔'' (بحار الانوار، ۷۵:۸۱)

یہ حدیث اگرچہ علمائے اخلاق کی مذکورہ تقسیم کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے مگر کافی حد تک اس کے قریب ضرور ہے۔ لیکن یہ حدیث مرسل ہے اور اس کی سند ضعف سے خالی نہیں ہے۔

بہرحال علمائے اخلاق نے فضائل کو جس طرح مندرجہ بالا چار فضائل میں تقسیم کیا ہے، اس پر مندرجہ ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

۱۔ بعض عادات کو جو یقیناً فضائل اخلاقی کا حصہ ہیں، کو مندرجہ بالا چار اخلاقی فضائل کے ذیل میں قرار دینا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً حسن ظن ایک اخلاقی فضیلت ہے جس کی ضد بدگمانی اور سوءظن ہے۔ اگر اس کو مندرجہ بالا چار فضائل میں سے کسی ایک کے تحت قرار دینا چاہیں تو اسے حکمت کے ذیل میں رکھا جائے گا جبکہ حسن ظن کو کسی بھی طور پر حکمت میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن ظن اور چیزوں کی صحیح شناخت دو الگ چیزیں ہیں بلکہ کبھی تو ایک دوسرے سے مکمل طور پر جدا دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی یہ مثال دی جا سکتی ہے کہ بعض اوقات ظنی قرائن اس بات کی نشاندہی کر رہے ہوتے ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں گناہ یا جرم کیا ہے مگر انسان حسن ظن کی وجہ سے انہیں نظر انداز کر دیتا ہے۔

اسی طرح مصائب پر صبر اور نعمتوں پر شکر فضائل اخلاق میں شمار ہوتے ہیں، حالانکہ نہ تو انہیں قوۂ ادراک کے تحت قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ قوۂ شہوت و غضب کے تحت۔ خاص طور پر اگر صابر و شاکر شخص ان صفات کے کسی فائدے کی بجائے خود انہی کو فضیلت سمجھتے ہوئے انہیں اپنائے ہوئے ہو۔

اسی طرح اور بھی بہت سی صفات ہو سکتی ہیں جو فضائل کے زمرے میں آتی ہیں مگر انہیں مندرجہ بالا چار میں سے کسی ایک فضیلت کے تحت درج کرنا بہت مشکل ہے۔

۲۔ مذکورہ تقسیم میں حکمت کو بنیادی اخلاقی فضائل میں شمار کیا گیا ہے اور اس کے معاملہ میں افراط و تفریط کو رذائل میں شمار کیا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حکمت حقائق کی شناخت کا فرض انجام دیتی ہے جبکہ اخلاق کا تعلق جذبات، جبلت اور ملکات نفس سے ہے، نہ کہ عقلی ادراک سے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھی سوچ رکھنے والے افراد کو خوش اخلاق نہیں کہا جا سکتا۔

اخلاق عقل کے لیے ایک ہتھیار تو ہو سکتا ہے لیکن عقل اور ''اچھائی کی پہچان'' کو اخلاق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بالفاظ دیگر عقل اور قوۂ ادراک انسانی جبلت اور جذبات کی رہنمائی کرتے ہیں، ان کو مناسب شکل و صورت دیتے ہیں جبکہ اخلاق ان کیفیات کا نام ہے جو ان فطری خواہشات اور جذبات کے اوپر عارض ہوتی ہیں۔

۳۔ یہ بات اگرچہ عام طور پر صحیح مانی جا سکتی ہے مگر اس کے باوجود ایسی چیزیں بھی نظر آتی ہیں جن میں افراط یعنی زیادہ روی قابل تصور نہیں ہے۔ مثال کے طور پر قوۂ عقلیہ جس قدر زیادہ ہو، بہتر ہے اور اس میں افراط یعنی زیادہ روی قابل تصور نہیں ہے۔ بعض

لوگ جو ''جربزہ'' کو قوۂ عقلیہ کے افراط کا نام دیتے ہیں، ان کا اندازِ فکر صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ ''جربزہ'' عقل و ذہانت کی کثرت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایک انحراف اور کج روی ہے جو مسائل کے فیصلہ میں جلد بازی کے نتیجہ میں رونما ہوتا ہے۔ (جربزہ سے مراد انسان کی وہ ذہنی اور عقلی کیفیت ہے جس کی مدد سے وہ حق کو باطل اور باطل کو حق، سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کر دکھاتا ہے جس طرح عدالتوں میں بعض تیز اور ذہین وکیل کیا کرتے ہیں)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عقل اور فکر کی بلندی میں اس مقام پر تھے کہ آپؐ کو ''عقلِ کل'' کہا جاتا ہے۔ کیا یہ خلاف فضیلت ہے؟

یہ بات بجا ہے کہ بعض اوقات زیادہ عقل اور ذہانت مشکلات اور تکالیف کا سبب بن جاتی ہے جبکہ غافل اور نادان افراد ان سے محفوظ رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کا شمار فضائل میں ہوتا ہے۔

اسی طرح مذکورہ تقسیم کے قائلین نے ''عدالت'' کو فضیلت اور اس کے افراط و تفریط کو ظلم کرنے اور ظلم برداشت کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ ظلم کرنا یا ظلم برداشت کرنا کسی بھی لحاظ سے ''عدالت'' میں افراط و تفریط نہیں ہیں بلکہ ان کی حقیقت کچھ اور ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ فضائل کو رذائل کے افراط و تفریط کے مقابل حد اعتدال سے تعبیر کرنا اگرچہ غالباً صحیح ہے لیکن اسے ایک کلیہ قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی اخلاقی مباحث میں اسے کوئی بنیادی مقام دیا جاسکتا ہے۔

نتیجہ

علمائے قدیم نے جن چار چیزوں کو اخلاق کی بنیاد قرار دیا ہے، وہ درحقیقت فلاسفۂ یونان کے طرزِ فکر کی تکمیل ہے۔ اسے اخلاقی صفات کی درجہ بندی کا ایک جامع معیار قرار نہیں دیا جاسکتا، اگرچہ بہت سے اخلاقی مسائل پر یہ صادق بھی آتا ہے۔

قرآن کے اخلاقی اصول

اب ہم قرآن کے اخلاقی اصولوں کے بارے میں بحث کی طرف واپس آتے ہیں۔ جس طرح عام طور پر کتابوں کے مباحث کو باقاعدہ ابواب اور فصول کی صورت میں مرتب کیا جاتا ہے، قرآن اس طرح کی جمع کردہ کتاب نہیں ہے بلکہ یہ آسمانی وحی کا ایک مجموعہ ہے جو بتدریج اور مختلف صورتوں اور حالات کے تقاضوں کے مطابق نازل ہوا۔ اس کے باوجود تفسیر موضوعی کے اسلوب کی رو سے اسے یہ شکل دی جاسکتی ہے۔ قرآن شریف کی تمام آیات کی تقسیم کے پیش نظر، اخلاق کے مبادیات کو مندرجہ ذیل چار شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ سے متعلق اخلاقی مسائل۔

۲۔ مخلوق سے متعلق اخلاقی مسائل۔

۳۔ اپنی ذات سے متعلق اخلاقی مسائل۔

۴۔ دنیا اور کائنات سے متعلق اخلاقی مسائل۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرنا، اس کے حضور خشوع وخضوع اور اس کے احکام کے سامنے راضی برضا رہنا اور سر تسلیم خم کرنا ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق پہلے شعبہ سے ہے۔

تواضع، فروتنی، ایثار وقربانی، محبت وخوش اخلاقی اور ہمدردی ورحم دلی جیسے مسائل کا تعلق دوسرے شعبہ سے ہے۔

دل کو ہر قسم کی ناپاکی اور آلودگی سے پاک کرنا، مشکلات ومصائب پر ثابت قدم رہنا، ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق تیسرے شعبہ سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے متعلق اسراف وتبذیر نہ کرنا اور اس جیسے مسائل کا تعلق چوتھے شعبہ سے ہے۔

ان چاروں اخلاقی بنیادوں کی جڑیں قرآن مجید میں موجود ہیں اور آئندہ مباحث میں ہم ان میں سے ہر ایک کے بارے میں اشارہ کریں گے۔

البتہ یہ چار شعبے معروف فلسفی ملا صدرا کی مشہور کتاب ''اسفار'' کے چار شعبوں سے مختلف ہیں۔ ملا صدرا اور ان کے ہم فکر انسان کو ایک مسافر اور خودسازی کو سیر وسلوک سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے مطابق عارف انسان کو چار سفر درپیش ہوتے ہیں:

۱۔ مخلوق سے حق کی طرف سفر (السفر من الخلق الی الحق)۔

۲۔ حق کے ساتھ حق میں سفر (السفر بالحق فی الحق)۔

۳۔ حق کی مدد سے حق کی طرف سے خلق کی طرف سفر (السفر من الحق الی الخلق بالحق)۔

۴۔ مخلوق کے اندر حق کی طرف سفر (السفر بالحق فی الخلق)۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ اسفارِ اربعہ یا سیر وسلوک الی اللہ کے چار مراحل ایک مختلف راستے کو طے کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے بعض حصوں اور اخلاق کے مذکورہ چار شعبوں میں کچھ شباہتیں بھی پائی جاسکتی ہیں۔

قرآن مجید میں ایسی آیات موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقیات کے اصول ان میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں سورۂ لقمان کی آیات ہیں جو اس آیت سے شروع ہوتی ہیں:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ

''ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی (اور بذریعہ الہام حکم دیا کہ) اللہ کا شکر ادا کرو۔'' (لقمان: ۱۲)

اس طرح معارف وعقائد کی گفتگو میں سب سے پہلے نعمتیں بخشنے والے کے شکر کی بات کی گئی ہے۔ ہم یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ شکر منعم خدا شناسی کا پہلا قدم ہے جیسا کہ علم عقائد وعلم کلام کے علماء نے وضاحت سے کہا ہے کہ شناخت خدا کا بنیادی محرک شکر نعمت کا مسئلہ ہے، اس لیے کہ جب انسان آنکھ کھولتا ہے تو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں ڈوبا ہوا پاتا ہے۔ ایسے میں اس کا

ضمیر بلا فاصلہ اسے ان نعمتوں کے عطا کرنے والے کی شناخت اور معرفت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہی معرفۃ اللہ کا پہلا قدم ہے۔

اس کے بعد اگلی آیت میں توحید کا ذکر کرتے ہوئے صراحت کے ساتھ فرماتا ہے:

لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾

''اللہ کے ساتھ شرک نہ کرو۔ یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

گفتگو کے ایک اور مرحلہ پر آخرت کا ذکر آتا ہے جو کہ معارف دینی میں دوسرے اہم ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس بارے میں لقمان اپنے بیٹے سے کہتے ہیں:

يٰبُنَيَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ

''اے میرے بیٹے! اگر خردل کے دانے کے برابر بھی (کوئی اچھا یا برا عمل) ہو اور کسی چٹان کے اندر یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں ہو، اللہ (قیامت کے دن حساب کے لیے) اسے حاضر کر دے گا۔''

(لقمان:۱۶)

اس کے بعد اخلاقیات اور حکمت عملی کے اصولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کے شکر کا حکم دینے کے بعد ماں باپ کا احترام اور ان کی شکر گزاری:

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ (لقمان:۱۴)

''اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے، اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے، یہ کہ تو اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر۔''

۲۔ نماز، اللہ تعالیٰ سے تعلق، اس کے حضور میں خشوع و خضوع اور دعا کی اہمیت:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ

''نماز قائم کرو۔'' (لقمان:۱۷)

۳۔ امر بالمعروف اور نہی از منکر:

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ

''اور نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔'' (لقمان:۱۷)

۴۔ زندگی کے تلخ حوادث پر صبر کرنا:

وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ

''جو مصیبت تمہیں پیش آئے، اس پر صبر کرو۔'' (لقمان: ۱۷)

۵۔ لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی:

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ

''اور لوگوں سے اپنا رخ مت پھیر۔'' (لقمان: ۱۸)

۶۔ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے ساتھ تواضع وفروتنی اور ترک تکبر:

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝۱۸

''اور زمین پر اترا کر مت چل، بے شک اللہ تعالیٰ کسی تکبر کرنے والے، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔'' (لقمان: ۱۸)

۷۔ بول چال میں میانہ روی اور اعتدال:

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ

''اور اپنی رفتار میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز کو پست کر۔'' (لقمان: ۱۹)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ فضائل اخلاقی کا ایک بڑا حصہ ان آیات میں حکمت لقمان کے نام سے بیان ہوا ہے اور آیت ۱۳ سے آیت ۱۹ تک شکر، صبر، خوش اخلاقی، تواضع میانہ روی، امر بالمعروف، نہی از منکر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سورۂ انعام کی تین آیات (۱۵۱، ۱۵۳) میں دس اہم احکام بیان کئے گئے ہیں جن میں اخلاقیات کا ایک بڑا حصہ بیان کر دیا گیا ہے، جیسے بچوں، یتیموں اور عام لوگوں پر ظلم وستم سے اجتناب، ہر ایک کے ساتھ عدل سے پیش آنا، رشتہ داروں اور دوستوں کی تعصب پر مبنی غیر عادلانہ حمایت سے اجتناب، ظاہری اور باطنی برائیوں سے اجتناب، ماں باپ کے حقوق کا احترام، تفرقہ پردازی سے پرہیز اور ہر قسم کے شرک سے اجتناب۔ [1]

اصولِ اخلاق اسلامی اور احادیث

اسلامی احادیث میں اخلاقیات کے بنیادی اصولوں کو حدیث کے اپنے مخصوص اسلوب میں بیان کیا گیا ہے جو حکمائے یونان کی روش سے بالکل مختلف ہے۔ ان میں سے چند احادیث درج ذیل ہیں:

۱۔ ایک مشہور حدیث جو کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، معروف صحابی امام سماعہ بن مہران کہتے

---

[1] مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ میں ان آیات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے اصحاب کی ایک جماعت آپؑ کی خدمت میں حاضر تھی کہ عقل وجہل کی گفتگو شروع ہوگئی۔آپؑ نے فرمایا:

''عقل اور جہل کے لشکروں کو پہچانو تا کہ ہدایت پاسکو۔''

میں نے عرض کیا:''میں آپؑ پر قربان ہوجاؤں، جب تک آپؑ بیان نہ فرمائیں، ہم کیسے جان سکتے ہیں؟''

امام علیہ السلام نے فرمایا:''اللہ نے پہلے عقل کو پیدا کیا، پھر جہل کو۔(عقل اطاعت کے راستہ پر چلی اور جہل معصیت کی راہ پر)اللہ نے عقل کو ۷۵ لشکر دیئے اور انہی کی ضد ۷۵ لشکر جہل کو دیئے۔''

پھر آپؑ نے عقل وجہل کے لشکروں کو اس طرح بیان فرمایا:

الخیر وھو وزیر العقل	''نیکی عقل کی وزیر ہے۔''
وجعل ضدہ الشر وھو وزیر الجھل	''اس کی ضد برائی ہے جو جہل کی وزیر ہے۔''
والایمان وضدہ الکفر	''ایمان اور اس کی ضد کفر ہے۔''
والتصدیق وضدہ الجمود	''تصدیق اور اس کی ضد انکار ہے۔''
والرجاء وضدہ القنوط	''امید اور اس کی ضد ناامیدی ہے۔''
والعدل وضدہ الجور	''عدالت اور اس کی ضد ظلم ہے۔''
والرضاء وضدہ السخط	''رضا اور اس کی ضد ناراضگی ہے۔''
والشکر وضدہ الکفران	''شکر اور اس کی ضد ناشکری ہے۔''
والطمع وضدہ الیاس	''طمع اور اس کی ضد مایوسی ہے۔''
والتوکل وضدہ الحرص	''توکل اور اس کی ضد حرص ہے۔''
والرافۃ وضدہ القسوۃ	''نرم دلی اور اس کی ضد سنگدلی ہے۔''
والرحمۃ وضدھا الغضب	''رحمت اور اس کی ضد غضب ہے۔''
والعلم وضدہ الجھل	''علم اور اس کی ضد جہل ہے۔''
والفھم وضدہ الحمق	''فہم اور اس کی ضد حماقت ہے۔''
والعفۃ وضدہ التھتك	''عفت اور اس کی ضد ناپاک دامنی ہے۔''
والزھد وضدہ الرغبۃ	''زہد اور اس کی ضد دنیا طلبی ہے۔''

والرفق وضده الخرق	''خوش خوئی اوراس کی ضد بدخوئی ہے۔''
والرهبة وضده الجراة	''خوف اوراس کی ضد جرأت ہے۔''
والتواضع وضده الكبر	''تواضع اوراس کی ضد تکبر ہے۔''
والتودة وضدها التسرع	''آہستگی اوراس کی ضد جلد بازی ہے۔''
والحلم وضده السفه	''حلم اوراس کی ضد نابردباری ہے۔''
والصمت وضده الهذر	''خاموشی اوراس کی ضد فضول کلامی ہے۔''
والاستسلام وضده الاستكبار	''حق کے سامنے جھک جانا اوراس کی ضد استکبار ہے۔''
والتسليم وضده الشك	''حق کو تسلیم کرنا اوراس کی ضد شک ہے۔''
والصبر وضده الجزع	''صبر اوراس کی ضد بے صبری ہے۔''
والصفح وضده الانتقام	''عفو ودرگزر اوراس کی ضد انتقام ہے۔''
والغنى وضده الفقر	''توانگری اوراس کی ضد فقر ہے۔''
والتذكر وضده السهو	''تذکر اوراس کی ضد غفلت ہے۔''
والحفظ وضده النسيان	''یادرکھنا اوراس کی ضد فراموشی ہے۔''
والتعطف وضده القطيعة	''محبت وپیوند اوراس کی ضد قطع تعلق ہے۔''
والقنوع وضده الحرص	''قناعت اوراس کی ضد حرص ہے۔''
والمواساة وضدها المنع	''ایثار اوراس کی ضد محروم کرنا ہے۔''
والمودة وضدها العداوة	''موت اوراس کی ضد عداوت ہے۔''
والوفاء وضده الغدر	''وفا اوراس کی ضد فریب کاری وپیمان شکنی ہے۔''
والطاعة وضدها المعصية	''اطاعت اوراس کی ضد معصیت ہے۔''
والخضوع وضده التطاول	''خضوع اوراس کی ضد برتری طلبی ہے۔''
والسلامة وضدها البلاء	''سلامتی اوراس کی ضد ابتلاء ہے۔''
والحب وضده البغض	''محبت اوراس کی ضد بغض ہے۔''
والصدق وضده الكذب	''سچ اوراس کی ضد جھوٹ ہے۔''

والحق وضده الباطل	''حق اور اس کی ضد باطل ہے۔''
والامانة وضدها الخيانة	''امانت اور اس کی ضد خیانت ہے۔''
والاخلاص وضده الشوب	''اخلاص اور اس کی ضد نیت کی آلودگی ہے۔''
والشهامة وضدها البلادة	''ہمت اور اس کی ضد پست ہمتی ہے۔''
والفهم وضده الغباوة	''فہم اور اس کی ضد نافہمی ہے۔''
والمعرفة وضدها الانكار	''معرفت اور اس کی ضد انکار ہے۔''
والمداراة وضدها المكاشفة	''پردہ پوشی اور اس کی ضد پردہ دری ہے۔''
وسلامة الغيب وضدها المماكرة	''کسی کی عدم موجودگی میں اس کی حفاظت اور اس کی ضد سازش ہے۔''
والكتمان وضده الافشاء	''راز کی حفاظت اور اس کی ضد افشائے راز ہے۔''
والصلاة وضدها الاضاعة	''نماز اور اس کی ضد نماز کو ضائع کرنا ہے۔''
والصوم وضده الافطار	''روزہ اور اس کی ضد روزہ نہ رکھنا ہے۔''
والجهاد وضده النكول	''جہاد اور اس کی ضد جہاد سے منہ موڑنا ہے۔''
والحج وضده نبذ الميثاق	''حج اور اس کی ضد اللہ کے پیمان کو توڑنا ہے۔''
وصون الحديث وضده النميمة	''گفتگو کی حفاظت، اس کی ضد چغل خوری ہے۔''
وبر الوالدين وضده العقوق	''والدین سے نیکی اور اس کی ضد بدسلوکی ہے۔''
والحقيقة وضدها الرياء	''جستجوئے حق اور اس کی ضد ریاکاری ہے۔''
والمعروف وضده المنكر	''معروف اور اس کی ضد منکر ہے۔''
والستر وضده التبرج	''حجاب اور اس کی ضد زینت کی نمائش ہے۔''
والتقية وضدها الاذاعة	''راز اور اس کی ضد افشائے راز ہے۔''
والانصاف وضده الحمية	''انصاف اور اس کی ضد تعصب ہے۔''
والتهيئة وضدها البغي	''صلح پسندی اور اس کی ضد بغاوت وسرکشی ہے۔''
والنظافة وضدها القذر	''پاکیزگی اور اس کی ضد گندگی ہے۔''
والحياء وضدها الجلع	''حیا اور اس کی ضد بے حیائی ہے۔''

والقصد وضده العدوان	''میانہ روی واعتدال اوراس کی ضد تجاوز ہے۔''
والراحة وضدها التعب	''راحت اوراس کی ضد تکلیف ورنج ہے۔''
والسهولة وضدها الصعوبة	''سہولت اوراس کی ضد صعوبت ہے۔''
والبركة وضدها المحق	''برکت اوراس کی ضد بربادی ہے۔''
والعافية وضدها البلاء	''عافیت اوراس کی ضد بیماری وابتلاء ہے۔''
والقوام وضدها المكاثرة	''اعتدال اوراس کی ضد کثرت طلبی ہے۔''
والحكمة وضدها الهواء	''حکمت اوراس کی ضد خواہشات کی پیروی ہے۔''
والوقار وضده الخفة	''وقاراوراس کی ضد سبکی ہے۔''
والسعادة وضدها الشقاوة	''سعادت اوراس کی ضد شقاوت ہے۔''
والتوبة وضدها الاصرار	''توبہ اوراس کی ضد گناہ پراصرار ہے۔''
والاستغفار وضده الاغترار	''استغفاراوراس کی ضد فریب خوردگی ہے۔''
والمحافظة وضدها التهاون	''حق کی حفاظت جس کی ضد حق کے بارے میں سستی ہے۔''
والدعاء وضده الاستنكاف	''دعااوراس کی ضد دعا سے انکار ہے۔''
والنشاط وضده الكسل	''نشاط اوراس کی ضد کاہلی ہے۔''
والفرح وضده الحزن	''خوشی اوراس کی ضد غم ہے۔''
والالفة وضدها الفرقة	''الفت اوراس کی ضد فرقت ہے۔''
والسخاء وضده البخل	''سخاوت اوراس کی ضد بخل ہے۔''

فلا تجتمع هذه الخصال كلها من اجناد العقل الا فی نبی اووصی نبی او مؤمن قد امتحن الله قلبه للايمان و اما سائر ذلك من مو الينا فان احدهم لا يخلو من ان يكون فيه بعض هذه الجنود حتى يستكمل وينقی من جنود الجهل فعند ذلك يكون فی الدرجة العليا مع الانبياء والا وصياء و انما يدرك ذلك بمعرفة العقل و جنوده و بمجانبة الجهل و جنوده وفقنا الله واياكم لطاعته و مرضاته انشاء الله

پھر امام علیہ السلام نے فرمایا

''عقل کے یہ لشکر نبی یا وصی کے سوا کسی میں جمع نہیں ہو سکتے یا پھر وہ مومن جس کے قلب کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کے لیے آزمالیا ہو۔ اس کے علاوہ ہمارے دیگر محبین میں ان میں سے کچھ لشکر پائے جاتے ہیں۔ وہ ان لشکروں کی تکمیل اور جہل کے لشکروں سے دوری کے لیے مصروف عمل رہتے ہیں۔ جب وہ یہ عمل مکمل کر لیتے ہیں تو انبیاء واوصیاء کے درجہ میں قرار پاتے ہیں۔ یہ عقل اور اس کے لشکروں کی معرفت اور جہل اور اس کے لشکروں سے دوری کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں اپنی اطاعت اور اپنی رضا کے حصول کی توفیق عطا فرمائے۔'' (اصولِ کافی، ۱: ۲۰ تا ۲۳)

مندرجہ بالا حدیث اخلاق اسلامی کے اصول وفروغ کے بارے میں ایک جامع حدیث ہے۔ بعض علماء نے اسے مستقل طور پر زیر بحث قرار دیا ہے اور اس کے بارے میں مستقل کتب لکھی ہیں۔

۲۔ نہج البلاغہ میں کلماتِ قصار میں ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے کسی نے سوال کیا کہ ایمان کیا ہے؟ (حدیث کے ذیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان سے مراد علمی اور عملی ایمان ہے جس میں اخلاقی اصول بھی شامل ہیں) امام علیہ السلام نے جواب دیا:

الایمان علی اربع دعائم، علی الصبر و الیقین و العدل و الجهاد

''ایمان چار ستونوں پر قائم ہے: صبر، یقین، عدالت اور جہاد۔''

پھر آپؑ نے مزید فرمایا:

والصبر منها علی اربع شعب، علی الشوق والشفق والزهدو الترقب

''صبر بھی چار بنیادوں پر قائم ہے: شوق، خوف، زہد اور انتظار۔''

(شوق سے مراد جنت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر و پاداش کا شوق، خوف سے مراد اللہ تعالیٰ کی سزا اور جہنم کا خوف ہے، یہ دونوں نیکی کی طرف حرکت اور برے کاموں سے باز رہنے میں موثر ثابت ہوتے ہیں۔ زہد یعنی دنیا کی چکا چوند سے بے رغبتی مصائب کو انسان کے لیے حقیر اور ناچیز بنا دیتا ہے جبکہ موت کا انتظار انسان کو اعمالِ حسنہ کی انجام دہی کی رغبت دلاتا ہے۔)

پھر آپؑ نے فرمایا:

و الیقین منها علی اربع شعب، علی تبصرة الفطنة و تاول الحکمة، و موعظة العبرة، وسنة الاولین

''یقین کے بھی چار شعبے ہیں: ہوشیاری میں بصیرت، حکمت کے دقیق نکات کا ادراک، حوادث سے

عبرت حاصل کرنا اور گزشتہ لوگوں کے حالات کا مطالعہ ومشاہدہ کرنا۔''

پھر آپؑ نے فرمایا:

والعدل منها علی اربع شعب، علی غائص الفهم، وغور العلم، و زهرة الحکم، و رساخة الحلم

''اور عدل کے بھی چار شعبے ہیں: فہم، امور کے لیے باریک بینی، علم میں غور وفکر، صحیح فیصلہ اور پائیدار حلم و بردباری۔''

آخر میں آپؑ نے فرمایا:

والجهاد منها علی اربع شعب، علی الامر بالمعروف و النهی عن المنکر و الصدق فی المواطن وشنئآن الفاسقین

''اور جہاد کے بھی چار شعبے ہیں: امر بالمعروف، نہی از منکر، معرکہ جنگ میں صداقت اور فاسقوں سے دشمنی۔''

اس کے بعد آپؑ نے کفر کے چار ستونوں کی اسی طرح تفصیل سے بیان فرمایا جو ایمان کی ضد ہے۔

(نہج البلاغہ: کلماتِ قصار: ۱۳۱ اصولِ کافی، ۲، ۳۹۱)

۳۔ ایک اور حدیث میں امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہما السلام فرماتے ہیں:

اربع من اعطیهن فقد اوتی خیر الدنیا و الاخرة، صدق حدیث واداء امانة وعفة بطن و حسن خلق

''چار چیزیں ایسی ہیں جو کسی کو مل جائیں تو اسے دنیا اور آخرت کی بھلائی مل جائے گی: بات چیت میں سچائی، امانت کی ادائیگی، عفت شکم (حلال خوری) اور حسن خلق۔'' (غرر الحکم)

۴۔ اسی بات کا خلاصہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں اس طرح بیان ہوا ہے:

ایک شخص ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

''مجھے ایسی نصیحت فرمایئے جس میں دنیا اور آخرت کی بھلائی موجود ہو اور وہ نصیحت طویل بھی نہ ہو۔''

آپؑ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

لا تکذب

''جھوٹ نہ بولو۔'' (تحف العقول: ۲۶۴)

حقیقت یہی ہے کہ تمام فضائل اخلاقی کی بنیاد سچائی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان نہ صرف دوسروں کے ساتھ بلکہ اپنے ساتھ اور خدا کے ساتھ بھی جھوٹ نہ بولے۔ جب انسان نماز میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں کھڑا ہو کر "ایاك نعبدو ایاك نستعین" یعنی "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں"، تو اس کی اس بات میں جھوٹ نہ ہو۔ وہ ہر قسم کے شیطانی اور نفسانی معبودوں سے دور ہو اور اس کا سر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے حضور میں جھکا ہوا ہو وہ مال و دولت، مقام و منصب اور کسی دوسری طاقت پر بھروسہ کرنے کی بجائے صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے اور اسی سے مدد طلب کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا بن جائے تو اخلاقیات کے تمام اصول و فروع اس میں زندہ ہو جائیں گے۔

۵۔ احادیث میں "افضل الاخلاق"، "اکرم الاخلاق"، "احسن الاخلق" اور "اجمل الخصال" جیسی اصطلاحات دیکھنے میں آتی ہیں جن میں اخلاق اسلامی کے اہم اصولوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک حدیث میں ہے:

سئل الباقر عن افضل الاخلاق فقال الصبر و السماحة

"حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے افضل ترین اخلاق کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا: صبر اور سخاوت۔" (بحار الانوار، ۳۶: ۳۵۸)

ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

اکرم الاخلاق الشخاء و اعمها نفعا العدل

"معزز ترین اخلاق سخاوت اور نفع بخش ترین اخلاق عدل ہے۔" (غرر الحکم)

نیز آپؑ ہی سے ایک اور حدیث میں آیا ہے:

اشرف الخلائق التواضع و الحلم و لین الجانب

"بہترین اخلاقی صفات تواضع، حلم اور نرم دلی ہیں۔" (غرر الحکم)

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا:

ای الخصال بالمرء اجمل فقال وقار بلامهابة، و سماح بلا طلب مکافاة، و تشاغل بغیر متاع الدنیا

"انسانی صفات میں سے کونسی صفت سب سے خوبصورت ہے؟ آپؑ نے فرمایا: وہ وقار جس میں ہیبت نہ ہو، وہ سخاوت جس میں بدلہ کی توقع نہ ہو اور غیر متاع دنیا میں مشغول ہونا۔" (اصول کافی، ۲: ۲۴۰)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں بری اخلاقی صفات کو اصول کفر کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

اصول الکفر ثلاثة: الحرص و الاستکبار و الحسد

''تین چیزیں کفر کی جڑ ہیں: حرص، تکبر اور حسد۔''

پھر آپؑ نے تینوں کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

فاما الحرص فان آدم حین نهی عن الشجرة حمله الحرص ان اکل منها، و اما الاستکبار فابلیس حین امر بالسجود الآدم استکبر، و اما الحسد فابنا آدم حیث قتل احدهما صاحبه

''آدم کو ایک درخت سے منع کیا گیا تھا۔ حرص نے ان پر حملہ کیا جس کی وجہ سے انہوں نے اس درخت سے کھا لیا۔ تکبر کی برائی یہاں سے ظاہر ہوتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو ابلیس نے تکبر کیا (اور سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور ہمیشہ کے لیے ملعون اور مردود قرار پایا)۔ حسد کا اظہار اس وقت ہوا جب آدم کے ایک بیٹے نے حسد کی وجہ سے دوسرے کو قتل کر دیا۔'' (اصولِ کافی، ۲:۲۸۹)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انسانیت کے سب سے بڑے حوادث جو اس نسل انسانی کے آغاز سے ہی رونما ہو گئے، ان تین صفات کی وجہ سے تھے۔ حرص نے آدم کو جنت سے نکالا، تکبر نے ابلیس کو ملعون و مردود بنایا اور حسد نے انسانی معاشرے میں قتل و خونریزی کی بنیاد ڈالی۔

ہم اس بحث کو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس ارشاد پر ختم کرتے ہیں جس میں آپؑ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ان اول ما عصی الله عزوجل به ست: حب الدنیا و حب الریاسة، و حب الطعام و حب النوم و حب الراحة و حب النساء

''چھ چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے پہلی بار اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی گئی: دنیا کی محبت، مقام اور عہدے کی محبت، غذا کی محبت، نیند کی محبت، آرام سے محبت اور عورتوں سے محبت۔'' (بحار الانوار، ۶۹:۱۰۵)

مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں اخلاقی فضائل اور اخلاقی رذائل کی بنیادوں کی اجمالی وضاحت ہو گئی ہے۔ لیکن جیسا کہ ان روایات سے ظاہر ہوتا ہے، ان کی کوئی خاص تعداد معین نہیں کی جا سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اچھے یا برے اخلاق کی مختلف النوع وجوہات ہو سکتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر جس طرح انسان کی جسمانی تعداد مقرر نہیں کی جا سکتی، اسی طرح اس کی روحانی صفات کی تعداد بھی گنتی سے باہر ہے۔

ساتواں باب

اخلاقی مسائل کا ایک دوسرے سے تعلق

فضائل اخلاقی غالباً ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے اور مربوط ہیں۔ اسی طرح رذائل اخلاقی کے درمیان بھی قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے درمیان مکمل جدائی غالباً ناممکن ہے۔

یہ ربط و تعلق بعض اوقات مشترکہ بنیاد کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی ان کے نتائج و ثمرات کی یکسانیت کی وجہ سے۔ مشترکہ بنیاد پر رونما ہونے والی صفات کی ہمارے پاس واضح مثالیں موجود ہیں۔ اکثر مواقع پر غیبت کی بنیاد حسد ہوتا ہے۔ حاسد کسی شخص کے ساتھ اپنے حسد کی وجہ سے اس کی عزت و آبرو کو داغدار کرنے کے لیے یا اس کی شخصیت کو خراب کرنے کے لیے اس کی غیبت کرتا ہے۔ اسی طرح کسی پر تہمت اور جھوٹا الزام لگانا، تکبر، احساس برتری اور دوسروں کو حقیر جاننا وغیرہ بھی حسد کے نتائج ہیں۔

اس کے برعکس بلند ہمتی جس طرح طمع کا راستہ روکتی ہے، اسی طرح حسد، تکبر، غرور اور خوشامد وغیرہ کا بھی مقابلہ کرتی ہے۔

نتائج اور ثمرات کے لحاظ سے بھی صفات کا باہمی ربط و تعلق واضح ہے۔ ایک جھوٹ کئی جھوٹ بولنے کا سبب ہوسکتا ہے اور ممکن ہے کہ انسان ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے بعض دوسرے گناہوں کا مرتکب ہوجائے یا ایک جرم کو چھپانے کے لیے مزید جرائم کا مرتکب ہوجائے۔

اس کے برعکس ایک اچھا اخلاقی عمل مثلاً ایمانداری، لوگوں کے درمیان محبت، دوستی اور معاشرتی تعاون کا باعث ہوجائے۔

احادیث میں بھی اس بات کی طرف لطیف اشارہ موجود ہے۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اذا کان فی الرجل خلة رائعة فانتظر اخواتها

''جب تم کسی شخص میں کوئی ایک اچھی صفت دیکھو تو منتظر رہو کہ اس صفت کی ساتھی صفات بھی اس میں پیدا ہوجائیں گی۔'' (بحار الانوار، ۶۶: ۴۱۱)

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان خصال المکارم بعضها مقید ببعض

''اچھی صفات ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں۔''

اسی حدیث کے ذیل میں ہے:

صدق الحدیث و صدق الباس و اعطاء السائل و المکافات بالصنایع واداء

الامانة و صلة الرحم والتودد الى الجار والصاحب و قرى الضيف وراسهن الحياء

''سچائی، میدان جنگ میں ثابت قدمی، سائل کو عطا کرنا، احسان کے بدلہ میں احسان، امانت کو ادا کرنا، صلہ رحمی، ہمسایوں اور دوستوں سے محبت اور مہمان نوازی کی بنیاد حیاء ہے۔''

(بحارالانوار، ۶۶:۳۷۵)

درحقیقت حیاء جو کہ گناہ سے نفرت کی روح ہے، تمام اخلاقی صفات کی بنیاد ہوسکتی ہے جس طرح سچائی کا امانت، میدانِ جنگ میں ثابت قدمی، دوستوں، رشتہ داروں اور ہمسایوں کے ساتھ محبت سے گہرا تعلق ہے۔

ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الله عزوجل جعل للشرا قفالا و جعل مفاتيح تلك الاقفال الشراب، و الكذب شر من الشراب

''اللہ تعالیٰ نے برائی کے تالے بنائے ہیں اور ان تالوں کی کنجی شراب ہے اور جھوٹ شراب سے بدتر ہے۔'' (بحارالانوار، ۶۹:۲۳۶)

یہ حدیث اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جھوٹ سب گناہوں کی جڑ بن سکتا ہے۔ یہی بات حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے ایک حدیث میں مختصر طور پر اس طرح بیان فرمائی ہے:

جعلت الخبائث كلها فى بيت و جعل مفتاحها الكذب

''تمام برائیاں ایک گھر میں رکھ دی گئی ہیں اور ان کی کنجی جھوٹ ہے۔'' (بحارالانوار: ۶۹، ۲۶۳)

ہم اس گفتگو کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں:

روایت میں ہے کہ ایک شخص آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا:

''یارسولؐ اللہ! میں تنہائی میں زنا، شراب خوری، چوری اور جھوٹ کا مرتکب ہوا ہوں۔ آپؐ ان میں سے جس ایک کو ترک کرنے کا حکم دیں، میں آپؐ کے لیے اسے چھوڑ دوں گا۔'' (معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص سارے گناہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا بلکہ آنحضرتؐ کی خاطر ان میں سے کسی ایک کو چھوڑنے پر تیار تھا)۔

آپؐ نے فرمایا: ''جھوٹ چھوڑ دو''۔

وہ شخص چلا گیا۔ جب اس نے زنا کا ارادہ کیا تو اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اگر آپؐ نے مجھ سے اس کے بارے میں پوچھ لیا اور میں نے سچ کہا تو آپ مجھ پر زنا کی حد جاری فرمائیں گے اور اگر جھوٹ بولا تو آپؐ کے ساتھ کئے ہوئے وعدہ کی خلاف

ورزی ہوگی۔

اسی طرح چوری اور شراب خوری کے وقت بھی اس کے ذہن میں ایسا ہی خیال پیدا ہوا۔ وہ شخص رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا:

''آپؐ نے ان سب گناہوں کا راستہ مجھ پر بند کر دیا ہے اور میں نے ان تمام گناہوں کو ترک کر دیا ہے۔'' (شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ۶: ۳۵۷)

مندرجہ بالا بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تربیت نفس اور تہذیب اخلاق کے لیے خاص طور پر کسی مخصوص اخلاقی صفت کی اصلاح کے لیے ان چیزوں سے کام کا آغاز کرنا چاہیے جو بنیادی حیثیت کی حامل ہیں اور ان اخلاقی صفات کی مدد حاصل کی جائے جو ان کے ساتھ پیوستہ اور مربوط ہیں۔

آٹھواں باب

کہاں سے شروع کریں؟

یہاں تک ہم علم اخلاق، اس کے آثار و نتائج اور محرکات وغیرہ کے بارے میں کلی اور عمومی آگہی حاصل کر چکے ہیں۔ اب ہم ان کلی اور عمومی معلومات کی روشنی میں تہذیب نفس کے راستے کا آغاز کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اب ہم مسائل ذہنی سے مسائل عینی کی طرف یا کلیات سے جزئیات کی طرف آتے ہیں۔

لیکن ضروری ہے کہ ہم یہاں بھی ذرا توقف کریں اور اس روحانی سفر کے لیے ضروری ساز و سامان کا انتظام کر لیں تا کہ دورانِ سفر حیرت و سرگردانی یا بدنظمی کا شکار نہ ہوں۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل امور کی طرف توجہ کرنا بھی ضروری ہے:

۱۔ اخلاقی مسائل کا سامنا کرنے کے بارے میں تین نظریات۔

۲۔ کیا ہر مرحلہ پر استاد اور رہنما کی ضرورت ہوتی ہے؟

۳۔ اندرونی اور بیرونی واعظ کا کردار۔

۴۔ وہ امور جو انسان کو اس عظیم مقصد تک پہنچنے میں مدد دیتے ہیں جیسے اللہ کا ذکر، عبادات اور دعائیں، زیارات، مسلسل نصیحت اور تلقین۔

۵۔ ماحول کی پاکیزگی۔

اخلاقی مسائل کا سامنا کرنے کے بارے میں تین نظریات

پہلا نظریہ یہ کہتا ہے کہ تہذیب نفس اندرونی دشمنوں کے ساتھ جہاد ہے جو کہ انسانوں کی گھات میں بیٹھے ہیں۔ یہ نظریہ رسولؐ اللہ کی معروف حدیث پر مبنی ہے جس کے مطابق آنحضرتؐ نے جہاد سے واپس آنے والے مجاہدین کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا:

مرحبا بقوم قضو الجهاد الاصغر و بقی علیهم الجهاد الاکبر فقیل یا رسول الله مالجهاد الاکبر، قال: جهاد النفس

''آفرین ہے ان لوگوں پر جو جہاد اصغر کر آئے ہیں اور جہاد اکبر ابھی ان پر باقی ہے۔ پوچھا گیا کہ یارسولؐ اللہ! جہادِ اکبر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: نفس کے خلاف جہاد۔'' (وسائل الشیعہ، ۱۱: ۱۲۲)

بحار الانوار میں اس حدیث کے ذیل میں یہ جملہ بھی ہے:

ثم قال: افضل الجهاد من جاهد نفسه التی بین جنبیه

''پھر آپؐ نے فرمایا: سب سے افضل جہاد نفس کے خلاف جہاد ہے جو انسان کے دونوں پہلوؤں کے بیچ میں ہے۔'' (بحارالانوار، ۶۷:۶۵)

قرآن مجید میں جہاد کے بارے میں آنے والی آیات میں سے بعض کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ جہاد اکبر کے بارے میں ہیں۔ اس لیے کہ یا تو خاص طور پر ان میں نفس کے خلاف جہاد مدنظر ہے، یا اس لیے کہ ان کا مفہوم وسیع ہے اور جہاد کی دونوں اقسام اس میں داخل ہیں۔

تفسیر قمی میں سورۂ عنکبوت کی آیت ۶

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶

''جو جہاد کرتا ہے اپنے فائدے کے لیے کرتا ہے۔ اللہ تمام عالمین سے بے نیاز ہے۔''

کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد شہوات، ناجائز لذتوں اور گناہوں کے خلاف جہاد ہے۔

اس آیت کی اس تفسیر کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں کہا گیا ہے کہ جہاد کا فائدہ خود جہاد کرنے والے کو ہوتا ہے اور یہ بات زیادہ تر نفس کے خلاف جہاد میں صادق آتی ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ اس پہلی آیت میں لقاء اللہ کے بارے میں بات کی گئی ہے:

مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۵

''جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو، سو اللہ تعالیٰ (سے ملنے) کا وہ معین وقت ضرور آنے والا ہے اور وہ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے۔''

یہ بات بالکل واضح ہے کہ لقاء اللہ اور شہودِ الٰہی اور قرب خدا کا حصول نفس کے خلاف جہاد کے مقاصد ہیں۔ سورۂ عنکبوت کی آخری آیت میں بھی یہ بات کہی گئی ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۶۹

''جو لوگ (خلوص نیت سے) ہماری راہ میں جہاد کریں، ہم یقیناً ان کو ہدایت دیں گے اور یقیناً اللہ نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔''

یہ آیت بھی ''فینا'' (ہماری راہ میں) اور ''لنهدینهم سبلنا'' (ہم یقیناً ان کو اپنی راہوں کی ہدایت کریں گے) جیسے قرائن کی وجہ سے زیادہ تعلق جہادِ نفس سے ہی رکھتی ہے، یا یہ کہ اس کا مفہوم عام ہے اور دونوں اقسام کے جہاد اس میں آجاتے ہیں۔

سورۂ حج کی آیت ۷۸ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ

''اور اللہ کی راہ میں جہاد کا حق ادا کرو۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی مقرر نہیں کی۔''

اکثر مفسرین نے کہا کہ اس آیت میں جہاد سے مراد، جہادِ اصغر اور جہادِ اکبر دونوں ہیں یا خاص طور پر جہادِ اکبر مراد ہے۔ جیسا کہ علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں اکثر مفسرین سے نقل کیا ہے کہ جہاد کا حق ادا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خلوصِ نیت سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے۔ (مجمع البیان، ۷: ۹۷)

علامہ مجلسیؒ نے بھی بحار الانوار میں اس آیت کو ان آیات کے زمرے میں قرار دیا ہے جو جہادِ اکبر سے متعلق ہیں۔ (بحار الانوار، ۶۷: ۶۳)

ایک مشہور حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے رسولؐ اللہ سے پوچھا: (میزان الحکمہ، ۲: ۱۴۱)

یارسول اللہ ای الجھاد افضل؟ قال ان یجاھد الرجل نفسہ و ھواہ

''یارسولؐ اللہ! کونسا جہاد افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: انسان کا اپنے نفس کے خلاف جہاد کرنا۔''

عقل و جہل کے لشکروں سے متعلق حدیث جو گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکی ہے، بھی اس بات کو بخوبی واضح کرتی ہے کہ انسان کا وجود ایک میدانِ جنگ ہے جس میں ایک طرف عقل اور اس کے لشکر کھڑے ہیں اور دوسری طرف جہل اور ہوائے نفس اور اس کے لشکر صف آراء ہیں۔ یہ دونوں لشکر مسلسل حالت جنگ میں ہیں۔ کمالات انسانی میں انسان کی ترقی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ عقل کے لشکر جہل کے لشکروں پر غالب آ جائیں۔ ان کی جزئی کامیابی بھی کمالات انسان میں جزئی ترقی شمار ہوتی ہے۔

دوسرا نظریہ: روحانی طب

اس نظریہ کے مطابق انسان کے جسم کی طرح انسان کی روح بھی بیمار ہوتی ہے اور اس کی صحت یابی کے لیے بھی روحانی معالجوں کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ اخلاقی بیماریوں سے نجات کی دواؤں کا استعمال کرنا چاہیے تاکہ انسان کی روح صحت مند، پرنشاط اور فعال ہو جائے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید کی بارہ آیات میں روحی اور اخلاقی بیماریوں کو ''مرض'' کہا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۰ میں منافقین کے بارے میں کہا گیا ہے:

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ

''ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے اور اللہ نے (ان کے گناہ اور نفاق کی وجہ سے) ان کی بیماری کو

بڑھا دیا ہے۔''

سورۂ احزاب آیت ۳۲ میں شہوت پرستوں کو ایسے بیمار قرار دیا گیا ہے جو پاکدامن عورتوں کو اپنے دام میں گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ اس آیت میں رسولؐ اللہ کی ازواج کو حکم دیا گیا ہے:

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ

''ایسے نرم لہجہ میں بات نہ کرو جس کی وجہ سے بیمار دل افراد کسی طمع میں مبتلا ہو جائیں۔''

دوسری آیات میں بھی ایسے معنی یا ان سے وسیع تر معنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ہر قسم کے اخلاقی اور عقیدتی انحراف پر محیط ہیں۔

ایک مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی نور معرفت، تقویٰ اور اخلاق سے سرشار دل کو قلب سلیم کا نام دیا گیا ہے:

وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ ﴿۸۷﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿۸۸﴾ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿۸۹﴾

''جس دن لوگ حساب کے لیے اٹھائے جائیں گے، مجھے رسوا نہ کرا اور اس دن جب مال اور اولاد کسی کو فائدہ نہ دیں گے سوائے اس کے جو قلب سلیم کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں آئے۔''

(سورۂ شعراء: ۸۷ تا ۸۹)

سلیم کا لفظ سلامت سے مشتق ہے جو فساد، انحراف اور بیماری کی ضد ہے۔ آئمہ معصومینؑ سے مروی روایات کی رو سے اس آیت میں قلب سلیم سے مراد وہ قلب ہے جو غیر اللہ سے خالی ہو (یعنی ہر قسم کی اخلاقی اور روحانی بیماری سے دور ہو)۔

قرآن مجید ایک اور مقام پر فرماتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ آرزو پوری ہوگئی اور وہ صاحب قلب سلیم ہو گئے۔

وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ ﴿۸۳﴾ إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿۸۴﴾

''اور ان کے پیروکاروں میں ابراہیم بھی تھے۔ جب وہ قلب سلیم کے ساتھ اپنے رب کے حضور میں حاضر ہوئے۔''

صاحب قلب سلیم ہونے کی خواہش جو حضرت ابراہیمؑ کے دل میں تھی، بندگی خدا کی راہ میں کوشش وجدوجہد، ایثار وقربانی، شرک اور ہوائے نفس کے خلاف جنگ کے نتیجہ میں پوری ہوگئی اور آخر کار وہ اس مقام پر فائز ہو گئے۔

احادیث میں بھی اس نظریہ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جن کے چند نمونے مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ نہج البلاغہ میں ایک خطبہ میں امیر المومنین علیہ السلام رسولؐ اللہ کی توصیف میں فرماتے ہیں:

طبيب دوا ربطبه قدا حكم مراهمه و احمى مواسمه يضع ذلك حيث الحاجة

اليه من قلوب عمی وآذان صم والسنة بكم، متتبع بدوائه مواضع الغفلة و مواطن الحيرة

''وہ ایک طبیب تھے جو اپنی طب کے ساتھ معاشرے میں چلتے تھے۔ آپؑ نے مرہم کو خوب محکم کیا اور اپنے اوزاروں کو گرم رکھا تا کہ اندھے دلوں، بہرے کانوں اور گونگی زبانوں کا علاج کر سکیں۔ وہ اپنی طب کو ساتھ لیے ان بیماروں کی تلاش میں پھرتے تھے جو فراموش ہو چکے تھے اور حیرت و سرگردانی میں گم تھے۔'' (خطبہ ۱۰۸)

۲۔ قلب سلیم، جس کے بارے میں دو آیات کی طرف گزشتہ سطور میں اشارہ کیا گیا ہے، اس کے متعلق بہت سی احادیث پائی جاتی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسولؐ اللہ سے پوچھا گیا:

ما القلب السليم؟

یعنی ''قلب سلیم کیا ہے؟''

آپؐ نے فرمایا:

دين بلا شك وهوى، و عمل بلا سمعة ورياء (مستدرک الوسائل، ۱: ۱۰۳)

''اس سے مراد ایسا دین ہے جو شک اور ہوس پرستی سے پاک ہو اور ایسا عمل جو سمعہ اور ریا سے دور ہو۔''

ایک اور حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

لا علم كطلب السلامة ولا سلامة كسلامة القلب

''کوئی علم سلامتی کی جستجو جیسا نہیں ہے اور کوئی سلامتی قلب کی سلامتی جیسی نہیں ہے۔'' (بحار الانوار ۷۵: ۱۶۴)

ایک اور حدیث میں حضرت امام علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

اذا احب الله عبدا رزقه قلبا سليما و خلقا قويما

''جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے قلب سلیم اور معتدل اخلاق عطا فرماتا ہے۔''

۳۔ متعدد احادیث میں اخلاق رذیلہ کو قلبی بیماریاں قرار دیا گیا ہے۔ حضورؐ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

اياكم والمراء والخصومة فانهما يمرضان القلوب على الاخوان، و ينبت عليهما النفاق

''جھگڑے اور مخالفت سے پرہیز کرو کیونکہ یہ دلوں میں بھائیوں کے خلاف بیماری پیدا کرتے ہیں اور ان کے اوپر منافقت اگتی ہے۔'' (بحار الانوار، ۷۰: ۳۹۹)

ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما من شیء افسد للقلب من خطیئته

''گناہ سے زیادہ کوئی چیز انسان کے دل کو خراب نہیں کرتی۔'' (بحار الانوار، ۷۰: ۳۱۲)

۴۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الا و من البلاء الفاقة و اشد من الفاقة مرض البدن، و اشد من مرض البدن مرض القلب

''خبردار! فقر ایک مصیبت ہے۔ اس سے بری مصیبت جسمانی بیماری ہے اور اس سے بڑی مصیبت دل کی بیماری ہے۔'' (نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۳۸۸)

۵۔ رسولؐ اللہ سے مروی ایک حدیث میں حسد کو ایسی بیماری کہا گیا ہے جو پوری انسانی تاریخ میں موجود رہی ہے:

الا انه قد دب الیکم داء الامم من قبلکم وهو الحسد، لیس بحالق الشعر، لکنه حالق الدین، و ینحی فیه ان یکف الانسان یده و یحزن لسانه و لا یکون ذاغمز علی اخیه المومن

''ایک بیماری جس میں گزشتہ اقوام مبتلا تھیں، تمہاری طرف آ چکی ہے۔ وہ بیماری حسد ہے جس سے جسم کے بال نہیں جھڑتے لیکن ان کا دین جھڑ جاتا ہے۔ اس سے بچنے کا راستہ یہ ہے کہ جب حسد کے آثار نظر آئیں تو اپنے ہاتھ اور زبان کو روک رکھے اور آنکھ کے اشارے سے بھی اپنے مومن بھائی کی اہانت نہ کرے۔'' (میزان الحکمہ، ۱: ۶۳۰)

۶۔ بہت سی احادیث میں اخلاقی رذائل کو ''داء'' کہا گیا ہے جس کے معنی بیماری کے ہیں۔ نہج البلاغہ میں خطبہ ۱۷۶ میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

فاستشفوه من ادوائکم ..... فان فیه شفاء من اکبر الداء و هو الکفر والنفاق و الغی و الضلال

''قرآن سے اپنی بیماریوں کی شفا طلب کرو۔ اس میں سب سے بڑی بیماری کفر، نفاق، گمراہی و

ضلالت کی شفا موجود ہے۔''

یہ الفاظ اور بھی بہت سی احادیث میں موجود ہیں۔

مختصر یہ کہ اس نقطہ نظر کے مطابق فضائل و رذائل اخلاقی انسان کی روح کی صحت یا بیماری کی علامات ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کے رسول، آئمہ معصومینؑ اور معلمین اخلاق روحانی طبیب ہیں جبکہ ان کی تعلیمات اور نصائح شفا بخش دوائیں ہیں۔

اس لحاظ سے جس طرح جسمانی بیماری کے علاج میں صحت مند ہونے کے لیے دوا کے ساتھ ساتھ پرہیز بھی ضروری ہے، اسی طرح روحانی اور اخلاقی بیماریوں سے نجات کے لیے بدکار دوستوں، برے ماحول اور ان تمام عوامل سے پرہیز ضروری ہے جو اخلاقی بیماریوں کے زیادہ ہونے کا باعث ہوتے ہیں۔

جسمانی بیماریوں کے علاج میں بعض اوقات جراحی یعنی آپریشن کی ضرورت پیش آتی ہے اور طبیب جراحی کے آلات سے جسم کو چاک کر کے علاج کرتا ہے۔ طب روحانی میں بھی غیر اخلاقی افعال کی سزا کے طور پر نافذ ہونے والی حدود، تعزیرات اور سزائیں جراحی یعنی آپریشن کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جسمانی طب میں دو مراحل بالکل واضح ہیں: احتیاط اور علاج۔ طب روحانی میں بھی یہ دونوں مراحل موجود ہیں۔ روحانی معالج اور معلمین اخلاق ایک طرف سے روحانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں تو دوسری طرف سے روحانی طور پر صحت مند افراد کو بیماری سے محفوظ رہنے میں احتیاطی تدابیر بتاتے ہیں۔

نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۰۸ میں حضرت علی علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توصیف میں جہاں مرہم کا ذکر کیا، وہاں زخموں کو جلانے والے اوزاروں کا بھی ذکر فرمایا۔ یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اخلاقی بیماریوں کا علاج بھی جسمانی بیماریوں کی طرح مختلف طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔

جسمانی بیماریوں کے علاج کی طب میں بعض عام ضابطے ہیں جن کا ہر بیماری کے علاج میں خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے جبکہ ہر بیماری کے علاج کے کچھ مخصوص قوانین اور ضوابط بھی ہوتے ہیں۔ طب روحانی میں بھی اسی طرح سے ہے۔ توبہ، ذکر الٰہی، نماز، روزہ اور دیگر عبادات، محاسبہ اور مراقبہ وغیرہ ہر روحانی بیماری کے علاج کے عام قوانین ہیں جبکہ ہر روحانی بیماری کے علاج کے مخصوص قوانین بھی موجود ہیں جو کتب روایات و اخلاق میں موجود ہیں۔

تیسرا نظریہ: سیر و سلوک

اس نظریہ کے مطابق انسانوں کو مسافروں سے تشبیہ دی گئی ہے جو نقطہ عدم سے سفر کا آغاز کر کے لقاء اللہ اور قرب خدا کی طرف گامزن ہیں جس کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔

اس روحانی سفر میں بھی جسمانی سفر کی طرح رہنما، سواری، سامانِ سفر، زادِ راہ، مشکلات و موانع کی برطرفی، ڈاکوؤں،

چوروں اور جان و مال کے دشمنوں سے بچاؤ کے انتظامات ضروری ہیں۔

اس روحانی سفر میں بھی کئی منازل اور دشوار گھاٹیاں، خطرناک کھائیاں درپیش ہوتی ہیں۔ انسان ان سب سے گزر کر ہی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

اگرچہ بعض حضرات کا اصرار ہے کہ سیر وسلوک، راستے اور منازل سے آگاہی، سواری، زادِ سفر اور رہنما سے آگاہی کا علم، علم کا اخلاق سے جدا اور الگ علم ہے۔ ممکن ہے ایک لحاظ سے ان کی بات درست ہو لیکن اگر وسیع نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سیر وسلوک روحانی بھی انہی راستوں سے گزرتا ہے جہاں سے اخلاقی تربیت کی راہیں گزرتی ہیں، یا کم از کم اتنا ضرور ہے کہ اخلاق الٰہی سیر وسلوک کا ایک حصہ ضرور ہے۔

بہر حال آیات قرآنی اور احادیث معصومینؑ میں بھی اس نظریے کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۵۵، ۱۵۶ میں ہے:

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

''اے رسولؐ! ان صابرین کو بشارت دے دیجیے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔''

اس آیت کی رو سے انسان ایک طرف سے اپنے آپ کو اللہ کی ملکیت قرار دیتا ہے اور دوسری طرف سے خود ایک ایسا مسافر بن جاتا ہے جو اللہ کی طرف محو سفر ہے۔

سورۂ علق میں ہے:

اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ﴿۸﴾

''یقیناً سب کی بازگشت تیرے رب کی طرف ہے۔'' (علق: ۸)

سورۂ انشقاق میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ﴿۶﴾

''اے انسان! تو بہت کوشش اور مشقت کے ساتھ اپنے رب کی طرف بڑھتا ہے اور آخر کار اس سے ملاقات کرے گا۔'' (انشقاق: ۶)

سورۂ رعد میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ

تُوْقِنُوْنَ۝۲

''اللہ نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے ذریعے اٹھا رکھا ہے جن کو تم دیکھ نہیں سکتے۔ وہ اسی طرح اپنی آیات کو بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین حاصل کرلو۔'' (رعد:۲)

قرآن مجید میں بیس سے زیادہ آیات میں لقاء اللہ کا ذکر پایا جاتا ہے جو سالکانِ الی اللہ اور عارفانِ الٰہی کی آخری منزل مقصود ہے۔ یعنی اس بے نظیر محبوب اور بے مثال مقصود کا معنوی اور روحانی دیدار۔

یہ بات صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کی آیات ایک لحاظ سے عمومیت رکھتی ہیں اور سب اس میں داخل ہیں لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فطرت اور خلقت کے اعتبار سے مومن اور کافر دونوں کی منزل وہی ہو جبکہ بعض لوگ انحراف اور گمراہی کی وجہ سے راستے میں ہلاکت کے گڑھوں میں گر جاتے ہیں اور اولیائے الٰہی اپنے اپنے درجات کے مطابق اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جیسے نطفہ آغازِ تخلیق سے ہی ایک مکمل انسان بننے کے مراحل طے کر رہا ہوتا ہے اور مکمل انسان بننے کے بعد بھی اپنے ارتقاء اور تکامل کی طرف حرکت کرتا رہتا ہے۔ ان میں سے بعض نطفے ابتدائی مراحل میں ہی ہلاکت کا شکار ہو جاتے ہیں جبکہ بعض ولادت کے بعد مختلف حوادث و آفات کی وجہ سے ہلاکت کا شکار ہوجاتے ہیں۔

ان سب باتوں سے زیادہ واضح اور روشن بات وہ ہے جس میں قرآن مجید نے تقویٰ کو بہترین زادِ راہ قرار دیا ہے۔ (زادِ راہ عام طور پر مسافر کے غذائی سامان کو کہا جاتا ہے لیکن لغت کی رو سے اس کے معنی وسیع تر ہیں اور ہر قسم کی ذخیرہ سازی اس میں آجاتی ہے۔)

بنابرایں یہ عبارت جو تقویٰ کو بہترین زادِ راہ قرار دے رہی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف انسان کے سفر کی نشاندہی کرتی ہے جس میں بہرحال زادِ راہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ یہ سفر روحانی ہے، لہٰذا اس کا زادِ راہ بھی روحانی ہے۔ احادیث میں بھی ایسی عبارات وسیع پیمانے پر پائی جاتی ہیں۔

نہج البلاغہ میں متعدد خطبات میں اس دنیا سے آخرت کے سفر کے لیے زادِ راہ لینے کی بات کی گئی ہے، خطبہ ۱۵۷ میں ہے:

فتزودوا فی ایام الفناء لایام البقاء

''ان فانی ایام میں باقی رہنے والے ایام کے لیے زادِ راہ کا انتظام کرلو۔''

خطبہ ۱۳۲ میں ہے:

ان الدنیا لم تخلق لکم دار مقام، بل خلقت لکم مجاز التزودوا منها الاعمال الی دار القرار

''یہ دنیا تمہارے لیے اقامت گاہ نہیں بلکہ گزرگاہ ہے تاکہ اس میں سے اقامت گاہ کے لیے اعمال کا

زادِراہ حاصل کرو۔''

خطبہ ۱۳۳ میں ایک انتہائی لطیف انداز میں اس طرح کہا گیا ہے:

والبصیر منها متزود والاعمی لها متزود

''بینائی رکھنے والا اس دنیا سے زادِراہ حاصل کرتا ہے جبکہ اندھا اس کے لیے زادِراہ حاصل کرتا ہے۔''

سورۂ ابراہیم کی آیت ۱ میں "صراط العزیز الحمید"، سورۂ حمد میں "الصراط المستقیم" اور بہت سی آیات میں سبیل اللہ اور انفال، آیت ۳۶ میں "لیصدوا عن سبیل اللہ" جیسے الفاظ اس نظریہ کی طرف اشارہ قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

نواں باب

سیر وسلوک کے مختلف طریقے

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جن ارباب سیر وسلوک اور علماء نے اس راہ میں قدم رکھا ہے اور قرآن وسنت کی تعلیمات کو اپنا رہنما قرار دیا ہے (نہ وہ صوفیاء جنہوں نے غیر اسلامی طریقے اپنائے) ان میں سے ہر ایک نے ایک روش اور طریقہ کار تجویز کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انہوں نے اس راہ کی منازل ومراحل کو بیان کیا ہے جن میں سے بعض کی طرف ہم ذیل میں مختصراً اشارہ کرتے ہیں تاکہ یہ بحث مکمل تر اور مفید تر ہو جائے۔

ا۔ سیر وسلوک بحر العلوم

اس کتاب کو علامہ بحر العلوم کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔ اگرچہ اس کے بعض حصوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ علامہ بحر العلوم کی طرف ان کی نسبت صحیح معلوم نہیں ہوتی لیکن اس کتاب کے بعض حصے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کتاب میں قرب الٰہی کو طے کرنے کے چار عوالم یا بعبارت دیگر چار منازل کا ذکر کیا گیا ہے:

ا۔ اسلام ۲۔ ایمان ۳۔ ہجرت ۴۔ جہاد

ان چاروں عوالم میں سے ہر ایک کے تین مراحل کا ذکر کیا گیا ہے جن کی مجموعی تعداد بارہ بنتی ہے۔ ان بارہ مراحل کو طے کرنے کے بعد سالك الی اللہ عالم خلوص میں داخل ہوتا ہے۔

یہ بارہ مراحل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ **اسلام اصغر**: اس سے مراد شہادتین کا اقرار، ان کی ظاہری تصدیق اور دینی فرائض کی بجا آوری ہے۔

۲۔ **ایمان اصغر**: اس سے مراد تمام معارف اسلامی کی قلبی تصدیق اور ان پر باطنی یقین ہے۔

۳۔ **اسلام اکبر**: اس سے مراد اسلام کے تمام حقائق اور اللہ تعالیٰ کے تمام اوامر ونواہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔

۴۔ **ایمان اکبر**: اس سے مراد اسلام اکبر کی روح اور معنویت ہے جس میں انسان مرتبہ اطاعت سے مرتبہ شوق ورضا ورغبت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

۵۔ **ہجرت صغری**، اس سے مراد دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنا ہے، جیسے مسلمانوں نے مکہ سے ہجرت کی تھی۔

۶۔ **ھجرت کبری:** اس سے مراد گناہگاروں، ظالموں اور بدکاروں سے دوری اختیار کرنا ہے۔

۷۔ **جہاد اکبر:** رحمن کے لشکروں کی مدد سے جو کہ عقل کے لشکر ہیں، شیطان کے لشکروں کے خلاف جہاد کرنا۔

۸۔ شیطان کے لشکر پر فتح و کامیابی اور ان کے تسلط سے آزادی اور عالم جہل وطبیعت سے نکلنا۔

۹۔ **اسلام اعظم:** اس سے مراد اپنی خواہشات نفس اور آرزوؤں پر غلبہ پانا ہے کیونکہ فتح وظفر کے بعد بیداری کے بیرونی عوامل، انحراف وگمراہی کے اندرونی عوامل پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اس مقام پر قلب سالک مرکز انوارِ الٰہی و فیوض ربانی بن جاتا ہے۔

۱۰۔ **ایمان اعظم:** اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس کے سامنے اپنے فنا کا مشاہدہ کرنا ہے۔ اس مرحلہ میں سالك **فادخلي في عبادي و ادخلي جنتي** (پس میرے بندوں میں داخل ہوجا اور میری جنت میں داخل ہوجا) کے عالم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس مرحلہ پر عبودیت اور بندگی کی حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے۔

۱۱۔ **ھجرت عظمی:** اس سے مراد اپنے وجود سے ہجرت کرکے اسے فراموش کر دینا ہے۔ یہ عالم وجودِ مطلق کی طرف سفر کا مرحلہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی مقدس ذات کی طرف کامل توجہ کا مرحلہ ہے جس کی طرف **وادخلي جنتي** میں خطاب کیا گیا ہے۔

۱۲۔ **جہاد اعظم:** اپنی ذات سے ہجرت کے بعد اس مرحلہ میں سالک اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس سے توسل کرتا ہے تاکہ اپنی خود بینی کے سارے آثار کو مٹادے اور نابود کردے اور توحید مطلق کے مرحلہ میں داخل ہوجائے۔

ان بارہ عوالم کو طے کرنے کے بعد سالک عالم خلوص میں داخل ہوجاتا ہے اور "**بل احیاء عند ربھم یرزقون**" (وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں رزق پاتے ہیں) کا مصداق بن جاتا ہے۔[1]

اس روش کے مطابق سیر وسلوک کی کیفیت

علامہ بحر العلوم سے منسوب رسالہ سیر وسلوک میں مندرجہ بالا عوالم کا ذکر کرنے کے بعد اس مشکل اور پر مشقت راہ کو طے کرنے کی کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں پچیس اہم ہدایات دی گئی ہیں۔ ہم ذیل میں ان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

قرب خدا کی راہ پر چلنے والا سالک الی اللہ انسان، اصول دین اور احکام دین اسلام سے مکمل آگاہی حاصل کرنے کے بعد سامان سفر باندھتا ہے اور مندرجہ ذیل پچیس ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنے مقصد کی طرف آگے بڑھنے لگتا ہے:

۱۔ ان عادات و رسوم وآداب کو ترک کرنا جو انسان کو اس راہ پر چلنے سے روکتے ہیں اور اسے آلائشات میں غرق کر دیتے ہیں۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے علامہ بحر العلوم سے منسوب رسالہ سیر وسلوک کی طرف رجوع فرمائیں۔ اس رسالہ میں بارہ عوالم کی ترتیب اور رسالہ "لب اللباب" میں علامہ طباطبائی کے ارشادات میں تھوڑا سا فرق پایا جاتا ہے۔ ہم نے یہاں ان کو باہم ملا دیا ہے۔

۲۔ منزل کی طرف بڑھنے کا پختہ عزم: اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اثنائے سفر میں کسی چیز سے خوفزدہ نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم پر بھروسہ کرتے ہوئے کسی قسم کے شک وشبہ کو دل میں داخل نہ ہونے دے۔

۳۔ نرمی اور تحمل: اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک وقت میں زیادہ امور کو اپنے اوپر مسلط نہ کرے کیونکہ ایسا کرنے سے ممکن ہے کہ اس کا حوصلہ سرد ہو جائے اور وہ متنفر ہو کر آگے بڑھنے سے رک جائے۔

۴۔ وفا: اس کے معنی یہ ہیں کہ جو توبہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حضور کی ہے، اس کے بارے میں وفادار رہے اور ان گناہوں کی طرف واپس نہ پلٹ جائے۔ نیز یہ کہ استاد اور رہنما کے احکامات وہدایات کے بارے میں بھی وفادار رہے۔

۵۔ ثابت قدمی اور استقلال: اس کے معنی یہ ہیں کہ جو لائحہ عمل وہ اپنے لئے منتخب کرے، آہستہ آہستہ اسے ایک پختہ عادت میں تبدیل کر دے تاکہ کسی صورت میں اس سے واپس نہ ہو سکے۔

۶۔ مراقبہ: اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام حالات میں اپنے اوپر کڑی نظر رکھے تاکہ کسی خلاف ورزی کا مرتکب نہ ہو۔

۷۔ محاسبہ: حدیث میں ہے:

لیس منا من لا یحاسب نفسه کل یوم

''جو شخص ہر روز اپنا محاسبہ نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں۔'' (ارشاد القلوب، باب ۳۹)

۸۔ مواخذہ: اس کے معنی یہ ہیں کہ جب کبھی کسی خطا کا مرتکب ہو، اپنے نفس کا مواخذہ کرے اور اس طرح اپنے آپ کو سزا دے۔

۹۔ مسارعہ: اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قرآنی حکم پر:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ

''اپنے رب کی مغفرت کی طرف سرعت اور تیزی سے آگے بڑھو۔'' (آل عمران: ۱۳۳)

عمل کرتے ہوئے ہر قدم اٹھانے میں جلدی کرے، کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان اپنی وسوسہ اندازی کے ذریعے اسے عمل سے روک دے۔

۱۰۔ ارادت: اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے باطن کو اس طرح پاکیزہ اور خالص کرے کہ اس کے اندر کوئی کھوٹ باقی نہ رہے اور وہ رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ کا مکمل عاشق ہو جائے۔

۱۱۔ ادب: یعنی اللہ تعالیٰ، رسولؐ اکرم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی بارگاہ کے ادب کو ملحوظ رکھے اور زبان پر ذرا بھی حرف اعتراض نہ آئے۔ ان کے احترام کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے، یہاں تک کہ دعا میں ایسے الفاظ بھی استعمال نہ کرے جو امر و نہی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

۱۲۔ نیت: اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سیر وسلوک کے تمام اعمال کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرنے کا قصد کرے۔

۱۳۔ صمت: صمت خاموشی کو کہتے ہیں۔اس کے معنی یہ ہیں کہ سالک غیرضروری گفتگو سے پرہیز کرے اورصرف ضروری گفتگو پر اکتفا کرے۔

۱۴۔ جوع: یعنی بھوکا رہنا اور کم کھانا۔ یہ بھی سیر وسلوک کی اہم شرائط میں سے ہے لیکن اس میں اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ اس میں اس حد تک نہ بڑھ جائے کہ کمزوری پیدا ہوجائے۔

۱۵۔ خلوت یعنی تنہائی: اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان گناہگاروں، دنیا پرستوں اور کم عقل لوگوں سے دور رہے اور عبادت اور ذکر کے وقت ہجوم اور شوروغوغا سے دور رہے۔

۱۶۔ شب بیداری: (خاص طور پر رات کے آخری حصے میں)، اس طرف قرآن شریف اور احادیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

۱۷۔ دوامِ طہارت: یعنی ہمیشہ باوضو رہنا کیونکہ اس سے انسان کے باطن میں ایک خاص نور پیدا ہوتا ہے۔

۱۸۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع اور عاجزی: یہ جس قدر زیادہ ہو، اتنی ہی کم ہے۔

۱۹۔ خواہشات نفسانی سے، خواہ وہ مباح ہی کیوں نہ ہوں، پرہیز کرنا۔

۲۰۔ رازداری: یہ سیر وسلوک کی سب سے اہم شرائط میں سے ہے اور اس راہ کے اساتذہ اس پر بہت تاکید کرتے ہیں۔اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی عبادات اور اپنے لائحہ عمل کو پوشیدہ رکھے (تاکہ اس کے اندر ذرا بھی نمود ونمائش اور ریاکاری کا پہلو پیدا نہ ہو)۔اسی طرح اگر عالم غیب سے کچھ حقائق اس پر منکشف ہوں تو انہیں بھی پوشیدہ رکھے اور کسی سے بیان نہ کرے (تاکہ عجب اور خود پسندی کا شکار نہ ہوجائے)۔

۲۱۔ استاد اور مربی کا ہونا: خواہ عام استاد اور مربی ہوں جن کی رہنمائی میں سیر وسلوک کے مراحل طے کرے یا خاص استاد اور مربی، جو کہ رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ ہیں۔

البتہ اس سلسلہ میں اس طرف دھیان رہے کہ استاد اور مربی کا انتخاب انتہائی احتیاط سے کیا جائے۔جب تک کسی کی علمی اور دینی صلاحیت کو آزمانہ لے، اس کی ہدایت پر بھروسہ نہ کرے کیونکہ بعض اوقات شیاطین بھی استاد کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں یعنی بھیڑ یئے گڈریے کا روپ دھار لیتے ہیں اور سالک کو گمراہ کردیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مرحوم علامہ طباطبائی فرماتے ہیں: ''حتی کہ غیر معمولی چیزوں کا ظاہر ہونا، انسان کے باطن کی خبر دینا، پانی اور آگ پر چلنا، مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کرنا بھی ہمیں یہ اطمینان نہیں دے سکتے کہ ان اعمال کا انجام دینے والا سیر وسلوک میں کوئی مقام یا پیش رفت حاصل کرچکا ہے، اس لیے کہ یہ سب باتیں روحانی مکاشفہ کے ذریعے بھی حاصل ہو جاتی ہیں جبکہ اس منزل سے منزل یقین تک کا راستہ بہت طویل ہے۔

۲۲۔ ورد: اس سے مراد وہ زبانی اذکار ہیں جو سالک کے لیے راستہ کھولتے چلے جاتے ہیں اور دشوار راستوں سے گزرتے ہوئے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے میں اس کی مدد کرتے ہیں۔

۲۳۔ نفی خواطر: اس کے معنی یہ ہیں کہ سالک اپنے دل کو مسخر کر کے اس پر اپنی حکومت قائم کر لے۔ اس کی سوچوں کا مرکز (concentration) اس طرح ہو کہ اسکے ارادہ واختیار کے بغیر کوئی خیال اس کے دل میں داخل نہ ہو سکے۔ یہ مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔

۲۴۔ فکر: اس کے معنی یہ ہیں کہ سالک معرفت اور آگاہی حاصل کرنے کے لیے صحیح اور گہرے غور وفکر کا مالک ہو اور اس کا تمام غور وفکر اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور افعال وتجلیات ہوں۔

۲۵۔ ذکر: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف قلبی توجہ ہے۔ یہ ورد سے الگ چیز ہے۔ ورد کا تعلق لفظ اور زبان سے ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کے معنی یہ ہیں کہ سالک کی ساری نظر اللہ تعالیٰ کے جمال پر مرکوز ہو اور وہ غیر اللہ کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لے۔

یہ تھا رسالہ سیر وسلوک کا خلاصہ جو کہ علامہ بحر العلوم کی طرف منسوب ہے۔ علامہ طباطبائی نے بھی معمولی فرق کے ساتھ رسالہ ''لب اللباب'' میں اسی روش کو اختیار کیا ہے۔

۲۔ مرحوم ملکی تبریزی کا طریقہ

مرحوم حاج میرزا جواد آقا تبریزی کا شمار سیر وسلوک کے بلند مرتبہ اساتذہ میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے رسالہ سیر و سلوک میں جو روش اختیار کی ہے وہ بعض جہات سے علامہ بحر العلوم سے منسوب رسالہ سے مختلف ہے۔

موصوف قرآن شریف کی مختلف آیات اور بہت سی احادیث کی روشنی میں لقاء اللہ کو سیر وسلوک کا مقصد اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ بات صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ لقاء اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کو آنکھ سے دیکھنا نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے پاکیزہ اور منزہ ہے کہ اسے آنکھوں سے دیکھا جا سکے۔ اسی طرح لقاء اللہ سے مراد قیامت کے دن ثواب اور نعمتوں سے ملاقات نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ایک قسم کا قلبی شہود ہے جس میں سالک دل کی آنکھ سے قلبی اور روحانی مشاہدہ کرتا ہے۔

اس کے بعد وہ اس طویل اور نشیب وفراز سے بھرپور راستے کو طے کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل تجویز کرتے ہیں جس کا خلاصہ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ اس راہ کو طے کرنے کی پختہ نیت۔

۲۔ گزشتہ اعمال سے صحیح توبہ کرنا، ایسی توبہ جو انسان کے وجود کی گہرائی اور اس کے اعمال پر اثر انداز ہو اور اسے اس طرح بدل ڈالے کہ گناہ کے اثرات اس کے جسم وجان سے زائل ہو جائیں۔

۳۔ صراطِ مستقیم کے لیے توشۂ سفر اختیار کرنا: اس کے لیے وہ چند لائحہ ہائے عمل تجویز کرتے ہیں:

الف۔ صبح کے وقت مشارطہ: (یعنی اپنے آپ سے شرط کرے کہ حق کے سوا کسی راہ پر نہیں چلے گا)۔

دن بھر مراقبہ: (یعنی سارا دن اپنے آپ پر کڑی نظر رکھے کہ راہ حق سے منحرف نہ ہوجائے)۔
شام کو محاسبہ: (یعنی اس طرف توجہ کرنا کہ دن بھر کیا کرتا رہا ہے)۔

ب۔ اوراد واذکار کی طرف توجہ اور بیداری اور سونے کے وقت کے اعمال کی طرف توجہ۔

ج۔ نماز شب کی طرف توجہ اور رات کی تنہائی میں اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز اور یہ کہ نیند اور غذا کی ریاضت میں غیر ضروری زیادہ روی سے پرہیز کرے۔

د۔ تازیانہ سلوک کا استعمال: اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی طرف توجہ کرنے اور حق کے بارے میں کسی قسم کی کوتاہی پر اپنا مواخذہ کرنا، اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرنا اور اپنے پیمان سے بیوفائی اور شیطان کی پیروی پر اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی سرزنش کرنا اور اخلاص کی راہ پر چلنے میں مسلسل جدوجہد کرنا۔

۴۔ تبدیلی کا آغاز: اس مرحلہ میں سالک ہر چیز سے قبل زندگی کے خاتمہ اور موت کے بارے میں غور وفکر کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کے بارے میں غور وفکر حب دنیا کو جلا کر خاکستر کر دینے اور بری صفات کی اصلاح کے لیے بہت موثر ہتھیار ہے۔ (اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے اسماء وصفات کے بارے میں غور وفکر کرے اور اولیائے حق کو یاد رکھے اور کوشش کرے کہ اپنے آپ کو ان کی صفات سے نزدیک کرے)۔

۵۔ منزل کے قریب: اس مرحلہ پر وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان کے تین عالم ہیں:

۱۔ عالم حس وطبیعت ۲۔ عالم خیال ومثال ۳۔ عالم عقل وحقیقت

عالم حس وطبیعت صرف اور صرف تاریکی اور ظلمت ہے۔ جب تک آدمی اس عالم سے عبور کر کے آگے نہ بڑھ جائے تو وہ عالم مثال میں ہرگز داخل نہیں ہوسکتا۔ عالم مثال کے حقائق شکل وصورت کے حامل ہوتے ہیں اور مادہ سے آزاد معلوم نہیں ہوتے۔

جب تک سالک عالم مثال سے عبور نہ کرلے، وہ عالم عقل میں داخل نہیں ہوسکتا۔ اس عالم سے مراد وہ عالم ہے جس میں حقیقت اور نفس انسانی کی کوئی صورت اور مادہ نہیں ہوتا۔ جب سالک عالم عقل میں داخل ہوجاتا ہے اور اپنے نفس کو مادہ اور صورت کے بغیر دیکھتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی معرفت عطا ہوتی ہے اور وہ "من عرف نفسه فقد عرف ربه" کا مصداق بن جاتا ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے مرحوم ملکی تبریزی کا رسالہ "لقاء اللہ" مطالعہ فرمائیں)۔

ایک اور طریقہ

آقائے حسن مصطفوی نے، جو ایک بلند پایہ عالم اور محقق ہیں، اپنے رسالہ "لقاء اللہ" میں سیر وسلوک الٰہی کے لیے ایک اور لائحہ عمل کا ذکر فرمایا ہے۔

وہ اس جامع رسالہ میں، جو کہ آیات واحادیث پر مبنی ہے، پہلے لقاء اللہ کے بارے میں آیات کا ذکر کرتے ہیں اور پھر ان کی تفسیر میں یہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ سے روحانی اور معنوی ملاقات ہے۔ اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ اس منزل مقصود کو پانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان ہر قسم کی مادی حدود، زمان ومکان کی حدود، یہاں تک کہ ذاتی حدود کو توڑ کر عالم لاہوت میں فنا ہو جائے اور اس آیت کا مصداق بن جائے:

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾

''اے مطمئن روح! اپنے رب کی طرف پلٹ آ، اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ پھر میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔'' (فجر: ۲۷ تا ۳۰)

اس کے بعد وہ اس عظیم منزل تک پہنچنے کے لیے پانچ مراحل کو طے کرنے کی تلقین کرتے ہیں:

۱۔ عقائد کی تکمیل اور مضبوطی اور اصولِ دین کی طرف خاص توجہ۔

۲۔ توبہ کے ذریعے گناہوں، اعمال صالح کی طرف واپسی (گناہوں سے پرہیز) اور واجبات کی انجام دہی۔

۳۔ نفس کو رذائل سے پاک اور اخلاقی فضائل سے آراستہ کرنے کے لیے تیار ہونا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے اپنی انانیت کو مٹا دینا اور اس کی عظمت کے سامنے فنا ہو جانا۔

اس مرحلہ میں مادی زندگی سے تعلق برطرف ہو جاتا ہے۔ مال، اولاد اور مادی لذتوں سے تعلق، روحانی اور معنوی تعلق میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس مرحلہ میں صرف ایک تعلق باقی رہ جاتا ہے اور وہ ہے سالک کا اپنی ذات سے تعلق۔ یہ تعلق اس قدر گہرا اور مضبوط ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ شدتِ ظہور کی وجہ سے مخفی ہے۔ یہاں پر ایک نکتہ قابل توجہ ہے کہ یہاں تک سالک نے جو بھی مراحل طے کیے، وہ اپنی ذات کے لیے کیے۔ بالفاظ دیگر وہ ''خود'' کو لقاء اللہ کی منزل تک لے جانا چاہتا تھا۔ وہ خود اعلیٰ مقامات تک پہنچنا چاہتا تھا، بارگاہِ خدا کے مقربین میں شامل ہونا چاہتا تھا اور ان معنوی کمالات کے حصول کا خواہش مند تھا۔ یعنی وہ ہر مقام پر اپنے بارے میں سوچتا تھا نہ کہ ہدف کے بارے میں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب بھی وہ کسی معنوی مقام پر پہنچتا تو اسے خوشی محسوس ہوتی تھی لیکن اگر کوئی اور اس مقام پر پہنچتا تو اسے اتنی خوشی نہ ہوتی۔ یہاں سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ اب ساری توجہ اسی ''میں'' (خود پسندی) کی طرف مبذول کی جائے تاکہ سالک کی ساری توجہ ظہور جلوۂ حق کی طرف ہو جو اس کی اپنی ذات کے ساتھ مشروط اور مقید نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں ''میں'' یعنی خود پسندی کا خاتمہ ہونا ضروری ہے تاکہ لقاء اللہ کی منزل تک پہنچنے کا یہ آخری حجاب برطرف ہو جائے۔

اس حجاب کو برطرف کرنے کے کئی طریقے ہیں:

الف۔ اللہ تعالیٰ کی توحید ذاتی اور توحید صفاتی کی طرف قلبی توجہ: اس توجہ سے سالک پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے

سامنے غیر اللہ کی حقیقت ہیچ ہے۔

ب۔ انانیت اور حجاب نفس کو برطرف کرنے کے لیے فکر و استدلال کا راستہ: اس کے معنی یہ ہیں کہ سالک اللہ تعالیٰ کو ایک لامحدود، ازلی و ابدی وجود کے طور پر دیکھتا ہے جو کہ حی مطلق ہے جبکہ اپنے آپ کو ہر لحاظ سے محدود، انتہائی عاجز و ناتواں اور سراپا فقر و احتیاج پاتا ہے۔ ایسا محتاج اور فقیر جو ایک لحظہ کے لیے بھی اللہ کے وجود کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا۔

ج۔ علاج بالاضداد: اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر مقام پر اپنے آپ کی طرف توجہ کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ اور اس کے صالح بندوں کے بارے میں غور و فکر کرے اور اپنے آپ کو ہر وقت اللہ تعالیٰ کے حضور میں محسوس کرے۔

۵۔ اس مرحلہ میں سالک ایک ملکوتی انسان بن کر عالم جبروت میں داخل ہو جاتا ہے۔ عالم جبروت میں داخل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے کمال خلوص و صفا کی وجہ سے اور نور الٰہی سے محو ہونے کی وجہ سے ایک اثر و رسوخ حاصل کر لیتا ہے اور الٰہی فرائض کو انجام دینے کے لیے، لوگوں کی ہدایت اور امر بالمعروف و نہی از منکر کے لیے مکمل معرفت کی بنیاد پر قدم اٹھاتا ہے۔

بالفاظ دیگر وہ کافی حد تک اپنی فکر سے آزاد ہو چکا ہوتا ہے اور تمام مسائل، احکام، فرائض اور آداب شریعت اور علاج میں مہارت حاصل کر چکا ہوتا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے علامہ حسن مصطفوی کی کتاب ''لقاء اللہ'' کی طرف رجوع فرمائیں۔ یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ موصوف نے اس کتاب میں ہر جگہ آیات اور احادیث سے اپنی بات کو ثابت کیا ہے۔

مکاتب سیر و سلوک کا خلاصہ اور نتیجہ

علمائے سیر و سلوک اور اس راہ پر چلنے والوں کی تعلیمات سے، جن کے نمونے پیچھے صفحات میں بیان ہو چکے ہیں، مندرجہ ذیل اصول سامنے آتے ہیں:

۱۔ سیر و سلوک کا حقیقی مقصد لقاء اللہ اور اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کا چشم و دل سے شہود اور اس کی بارگاہِ مقدس میں روحانی اور معنوی طور پر حاضر ہونا ہے۔

۲۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ انسان تمام گناہوں سے توبہ کرے، اپنے آپ کو اخلاقی رذائل سے پاک اور اخلاقی فضائل سے آراستہ کرے۔

۳۔ اس راہ میں آداب اربعہ یعنی مشارطہ، مراقبہ، محاسبہ اور مواخذہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ یعنی صبح کے وقت انسان یہ طے کر لے کہ دن بھر گناہ کے قریب نہیں جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کوئی عمل انجام نہیں دے گا۔ پھر دن بھر اپنے سرکش نفس پر کڑی نظر رکھے۔ رات کو سونے سے قبل دن بھر کی کارکردگی کا جائزہ لے اور اپنا محاسبہ کرے۔ اگر محاسبہ

کے دورانِ ثابت ہو کہ اس سے کوئی غلط کام سرزد ہوا ہے تو بعض لذتوں کو ترک کر کے نفس کو سزا دے۔

۴۔ ہوائے نفس کے ساتھ جنگ کرنا، اس لیے کہ یہ اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور اس کے خلاف جہاد واجب ترین واجبات میں سے ہے۔

۵۔ شرع مقدس میں وارد ہونے والے اذکار و اوراد کی طرف توجہ کرنا جیسے "لاحول و لاقوۃ الا باللہ" اور "لا الہ الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین"، اسی طرح "یا اللہ"، "یا حی" اور "یاقیوم" یہ اور ایسے اذکار اس راہ پر چلنے کی قوت کا سبب بنتے ہیں۔

۶۔ اللہ تعالیٰ کی توحید ذات، توحید صفات اور توحید افعال کی طرف قلبی توجہ کرنا اور اس کی صفات کمال وجلال میں غرق ہو جانا۔ یہ بھی اس راہ پر نشیب وفراز کو طے کرنے کا ایک موثر توشہ وسامان ہے۔

۷۔ انانیت کے بت کو توڑنا جو سب سے بڑا بت ہے، یہ اس مقصد تک پہنچنے کی اہم ترین شرائط میں سے ہے۔

۸۔ ایسے استاد اور مربی کے زیر سرپرستی کام کرنا جس کی حیثیت ایک طبیب کی سی ہوتی ہے اور جو بیمار کا علاج کرتا ہے۔

اگرچہ بعض علماء نے اسے سیر وسلوک کی شرط قرار دیا ہے جبکہ بعض اس پر خاص اصرار نہیں کرتے۔ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ایسے شیاطین کے خطرناک جال میں پھنس جاتے ہیں جو اپنے آپ کو ایک فرشتہ کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی پیروی میں لوگ اپنے دین، دنیا اور ایمان واخلاق سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

بعض علماء نے لوگوں کی ہدایت ورہنمائی کے کام کو اور امر بالمعروف اور نہی از منکر کو، جو انبیاء واولیا کا کام ہے، سیر وسلوک کے آخری مرحلہ پر قرار دیا ہے جبکہ بعض نے اس کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا اور اسے سالک کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

اس کتاب میں ان مباحث کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے:

۱۔ ان افکار ونظریات کا خلاصہ پیش کرنا جو کہ بہر حال اخلاقی مباحث سے تعلق رکھتے ہیں تا کہ اس کتاب کے قارئین زیادہ آگہی اور بصیرت کے ساتھ تہذیب اخلاق کی راہ پر قدم اٹھا سکیں۔

۲۔ اس راہ پر چلنے والے تمام افراد کو خبردار کرنا کہ حق اور باطل کے درمیان فرق بہت لطیف ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پاک دل نوجوان آب بقا تک پہنچنے کی امید میں اس وادی میں قدم رکھتے ہیں لیکن عقل وشریعت سے منحرف ہو کر کفر وضلالت کی گھاٹیوں میں گر جاتے ہیں اور رہبر نما رہزنوں کے ہتھے چڑھ کر اپنا سب کچھ برباد کر دیتے ہیں۔

دسواں باب

کیا ہر مرحلہ پر استاد اور رہنما کی ضرورت ہوتی ہے؟

سیر وسلوک کے بہت سے علماء کا عقیدہ ہے کہ کمال وفضیلت، تقویٰ واخلاق اور قرب الی اللہ کی راہ پر چلنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی استاد کی سرپرستی میں عمل کریں۔ گزشتہ صفحات میں رسالہ سیر وسلوک، منسوب بہ بحر العلوم اور مرحوم علامہ طباطبائی کے رسالہ ''لب اللباب'' کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ہم نے یہ بیان کیا کہ ان دونوں کتابوں کی فصل ۲۱ میں استاد اور مربی کی سرپرستی میں عمل کرنے کو سالک کا فریضہ قرار دیا گیا ہے، خواہ یہ اساتیدِ خاصہ یعنی انبیاء اور آئمہ معصومین علیہم السلام ہوں یا عام اساتذہ جو اس راہ پر چلنے والی شخصیات ہیں۔

لیکن اس فن کے صاحب نظر افراد خبردار کرتے ہیں کہ تقویٰ اور تہذیب نفس کی راہ پر چلنے والوں کو چاہیے کہ بآسانی اپنے آپ کو ہر کس وناکس کی سرپرستی میں نہ دیں بلکہ انہیں چاہیے کہ جب تک ان کی علمی اور دینی صلاحیت کو اچھی طرح پرکھ نہ لیں، کسی کی سرپرستی کو قبول نہ کریں۔ یہاں تک کہ غیر معمولی کام انجام دینا، پوشیدہ امور کی خبریں دینا، مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کرنا، حتی کہ پانی اور آگ کے اوپر سے گزرنا بھی کسی کے برحق ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتے، اس لیے کہ غیر مہذب جوگی وغیرہ بھی اس قسم کے کام انجام دے سکتے ہیں۔

بعض علماء کا کہنا ہے کہ سیر وسلوک کے آغاز میں استاد کی سرپرستی میں عمل کرنا ضروری ہے لیکن جب اس سلسلہ میں قابل ذکر پیش رفت حاصل ہوجائے تو استاد اور سرپرست کی ہمراہی ضروری نہیں رہتی مگر یہ بات یقینی ہے کہ استادِ خاص یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام سے کسب فیض ہر مرحلہ پر لازم ہے۔

استاد اور مربی کی ضرورت کے اثبات کے لیے بعض اوقات سورۂ انبیاء کی آیت ۷ سے استدلال کیا جاتا ہے:

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝

''اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھو۔''

لیکن یہ آیت تعلیم کے بارے میں ہے، نہ کہ تربیت کے بارے میں۔ لیکن چونکہ بہت سے مقامات پر تربیت کی بنیاد تعلیم پر ہوتی ہے، لہٰذا ایسے مقامات پر علماء سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس میں اور کسی خاص فرد کو اپنے اعمال اور اخلاق کا سرپرست اور نگہبان بنانے میں واضح فرق ہے۔

بعض اوقات اس مؤقف پر حضرت موسیٰ اور حضرت خضرؑ کے واقعہ سے استدلال کیا جاتا ہے جو قرآن شریف میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک اولوالعزم نبی ہونے کے باوجود حضرت خضر علیہ السلام سے بے

نیاز نہیں تھے۔ وہ کہتے ہیں:

طی این مرحله بی همرهی خضر مکن
ظلمات است بترس از خطر گمراهی
(اس مرحلہ کو خضر کی ہمراہی کے بغیر طے نہ کرو
تاریکیاں بہت ہیں، گمراہی کے خطرے سے ڈرو)

لیکن اگر داستانِ موسیٰ و خضر میں غور کیا جائے تو یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے حضرت خضر کی شاگردی اختیار کی تھی جس کا مقصد کائنات میں ہونے والے مختلف حوادث کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی حکمت کے اسرار کا علم حاصل کرنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم، علم ظاہر تھا جس کا تعلق ظاہری اعمال و فرائض سے تھا جبکہ حضرت خضر کا علم، علم باطن تھا اور اس کا دائرہ کار ظاہری اعمال و فرائض سے بالاتر تھا۔ [1]

اس داستان میں اگرچہ استاد کے حضور سے کسب فضائل کی اہمیت کی طرف اجمالی اشارہ ملتا ہے لیکن اس میں اور تمام مراحل تہذیب نفس میں ایک خاص استاد کا انتخاب کرنے میں فرق ہے۔

اس مسئلہ پر لقمان اور ان کے بیٹے کے واقعہ سے بھی استدلال کیا جاتا ہے جس میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اس الٰہی استاد نے اپنے بیٹے کے اخلاق کی سرپرستی کی اور منزل کمال تک پہنچنے کی راہ طے کرنے میں [2] اس کی مدد کی۔

علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں آپؑ نے فرمایا:

هلك من ليس له حكيم يرشده

''جس کو کوئی ہدایت کرنے والا حکیم نہ ملے، وہ ہلاک ہو گیا۔'' (بحار الانوار، ۷۵:۱۵۹)

لیکن ان تمام دلائل سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کے اخلاقی مباحث میں ہمیشہ مخصوص استاد کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر وہ نہ ہو تو اخلاق، تقویٰ، تربیت نفس اور سیر و سلوک درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں جو آیات و احادیث سے استفادہ کرتے ہوئے اور کتب اخلاق میں بزرگوں کے ارشادات سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے اس راہ کو طے کر کے اعلیٰ مقامات تک پہنچے ہیں۔ اگرچہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مخصوص استاد کا ہونا اور پاکیزہ و مقدس افراد کے انفاس قدسیہ سے مدد لینا، راہِ کمال کو کم از کم مدت میں طے کرنے اور اخلاقی مشکلات کو حل کرنے کا اچھا ذریعہ ہوتا ہے۔

نہج البلاغہ میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

---

[1] مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ، جلد ۱۲، سورۂ کہف کی آیات ۶۰ تا ۸۲ کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیے۔

[2] مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۱۷ کی طرف رجوع فرمائیے۔

ايها الناس استصبحوا من شعلة مصباح واعظ متعظ

''اے لوگو! اپنے دل کے چراغ کو کسی باعمل واعظ کی نصیحت کے شعلے سے روشن کرو۔'' (خطبہ،۱۰۵)

لیکن بدقسمتی سے بہت سی مثالیں ایسی ہیں جہاں استاد کے وجود سے الٹے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اپنے آپ کو مربی اور مرشد کے طور پر متعارف کروایا، حالانکہ وہ رہبر نہیں بلکہ رہزن تھے اور پاک دل افراد کو تصوف کی راہ یا کسی اور گمراہی کی طرف لے گئے یا شرمناک اخلاقی برائیوں کی طرف لے گئے۔ اسی لیے ہم اس راہ پر چلنے والے تمام افراد کو خبردار کرتے ہیں کہ اگر وہ اخلاقی مسائل میں استاد کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں تو بہت احتیاط سے کام لیں اور اپنے انتخاب میں سخت گیری اور باریک بینی سے کام لیں۔ کبھی بھی ظاہر کا دھوکا نہ کھائیں بلکہ افراد کی سابقہ کارکردگی کا اچھی طرح جائزہ لیں اور اہل علم کے مشورے سے کسی استاد اور مربی کا انتخاب کریں تاکہ اپنے مقصد کو پاسکیں۔

واعظ درونی کا کردار

بیرونی واعظ کے بارے میں کافی گفتگو ہوچکی ہے۔ اب واعظ درونی کے بارے میں گفتگو کی باری ہے۔ بعض احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان کا بیدار ضمیر جسے واعظ درونی کا نام دیا گیا ہے، اخلاق وتقویٰ کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے بلکہ اس کے بغیر اس راہ کو طے کرنا بہت مشکل ہے۔

ایک حدیث میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

ابن آدم انك لاتزال بخير ما كان لك واعظ من نفسك، وما كانت المحاسبة من همك

''اے فرزند آدم! جب تک تمہارے پاس واعظ درونی موجود ہو اور جب تک خود احتسابی تمہارا سب سے اہم کام ہو، تم ہمیشہ خیر اور نیکی کی راہ پر رہو گے۔'' (بحارالانوار،۵۷،۷ ۱۳)

معمولی سے فرق کے ساتھ آپؑ سے ہی ایک اور حدیث بھی منقول ہوئی ہے۔ (بحارالانوار،۵۷:۷ ۱۴)

نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

واعلموا انه من لم يعن على نفسه حتى يكون له منها واعظ وزاجر، لم يكن له من غيرها لا زاجر ولا واعظ

''خوب جان لو کہ جب تک کوئی خود اپنی مدد نہ کرے اور اس کے اندر واعظ اور منع کرنے والا موجود نہ ہو، دوسروں کی نصیحت اس پر اثر انداز نہیں ہوگی۔'' (خطبہ:۹۰)

واضح سی بات ہے کہ اس راہ میں انسان کو ایک ایسے واعظ کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ ہو، اس کے اندر کے رازوں سے باخبر ہو اور ہر وقت اس کی نگرانی کرے۔ واعظ درونی یعنی بیدار ضمیر کے سوا یہ کام کون کرسکتا ہے! یہی وہ واعظ ہے جو ارتکاب گناہ وخطا کے بعد اولین فرصت میں انسان کو سرزنش کرتا ہے اور اخلاقی انحطاط کی پستی میں گرنے سے باز رکھتا ہے۔

ایک اور حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اجعل من نفسك على نفسك رقيبا

''اپنے اندر میں سے اپنے اوپر ایک نگران مقرر کرو۔'' (غرر الحکم)

ایک اور حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام سے ہی مروی ہے:

ينبغي ان يكون الرجل مهيمنا على نفسه مراقبا قلبه، حافظا لسانه

''ضروری ہے کہ انسان اپنے نفس پر مسلط ہو، اپنے قلب کی نگرانی کرے اور اپنی زبان کی حفاظت کرے۔'' (غرر الحکم)

گیارھواں باب

اخلاقی فضائل کی پرورش کے لیے ضروری تیاری

تہذیب اخلاق میں ترقی اور پیش رفت کے بارے میں اب تک جن چیزوں کا ہم نے ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ بھی کئی اور عوامل ہیں جو رذائل اخلاقی کے خلاف جہاد اور فضائل اخلاقی کی تقویت کے لیے بہت موثر ہیں۔ ان میں مندرجہ ذیل امور کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ ماحول کی پاکیزگی

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ انسان کا معاشرتی ماحول اس کے باطن اور اس کے اعمال پر غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوتا ہے، اس لیے کہ انسان بہت سی صفات اپنے ماحول سے حاصل کرتا ہے۔ پاکیزہ ماحول میں عام طور پر پاکیزہ افراد پروان چڑھتے ہیں اور آلودہ ماحول میں آلودہ افراد کی پرورش ہوتی ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ انسان ناپاک ماحول میں پاکیزہ زندگی گزار سکتا ہے اور اس کے برعکس پاکیزہ ماحول میں انسان ناپاک زندگی بھی گزار سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر ماحول افراد کی خوبی یا بدی کی علت تامہ نہیں ہے لیکن ایک اہم عامل کے طور پر اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ممکن ہے بعض لوگ ماحول کے جبر کے قائل ہوں۔ ہم اگرچہ ماحول کے جبر کے قائل نہیں ہیں لیکن موثر عوامل کی قوی تاثیر کا انکار ہرگز نہیں کرتے۔

اس مختصر اشارہ کے بعد ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان آیات کا جائزہ لیتے ہیں جو انسان کی شخصیت پر ماحول کے اثر کے بارے میں دلالت مطابقی یا دلالت التزامی کے انداز میں گفتگو کر رہی ہیں:

۱۔ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۔ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿٥٨﴾

"پاکیزہ زمین کے عمدہ نباتات اس کے رب کے حکم سے اگتے ہیں جبکہ ناپاک زمین سے ناکارہ پودے اگتے ہیں۔ ہم اپنے دلائل کو اسی طرح شکر گزار لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں۔" (اعراف: ۵۸)

۲۔ وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلَىٰ قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَىٰ أَصْنَامٍ لَهُمْ ۚ قَالُوا يَا مُوسَى اجْعَل لَّنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ ۚ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ﴿١٣٨﴾

''اور ہم بنی اسرائیل کو دریا کے پار لے گئے۔ پھر وہ ایک ایسی قوم کے پاس پہنچے جو اپنے بتوں کی عبادت کر رہی تھی تو وہ کہنے لگ کہ اے موسیٰ! ہمیں بھی ایک ایسا خدا بنا دو جیسے ان کے خدا ہیں۔ موسیٰ نے کہا: تم جاہل لوگ ہو۔'' (اعراف:۱۳۸)

۳۔ وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾

''نوحؑ نے کہا: اے میرے رب! روئے زمین پر کسی کافر کو زندہ نہ چھوڑ، اس لیے کہ اگر تو نے انہیں زندہ چھوڑ دیا تو فاجروں اور کافروں کو ہی جنم دیں گے۔'' (نوح:۲۷۔۲۸)

۴۔ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

''اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! میری زمین وسیع ہے، پس تم صرف میری عبادت کرو (اور دشمنوں کے دباؤ کے آگے نہ جھکو)۔'' (عنکبوت:۵۶)

۵۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾

''جن لوگوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، جب فرشتے ان کی روح قبض کریں گے تو ان سے کہیں گے کہ تم کس حال میں تھے؟ (مسلمان ہونے کے باوجود کیوں کفار جیسے تھے) وہ جواب دیں گے کہ ہم اپنے وطن میں کمزور تھے۔ فرشتے کہیں گے کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم کہیں ہجرت کر جاتے (ان کے پاس کوئی بہانہ نہ ہوگا) اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ان کا کیا ہی انجام ہے۔'' (نساء:۹۷)

تفسیر ونتیجہ

پہلی آیت میں انسان کے اعمال وافعال پر ماحول کے اثر کو لطیف پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت کے ذیل میں علمائے تفسیر نے مختلف قسم کے مطالب بیان کیے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وحی کا صاف اور خوشگوار پانی بارش کے قطروں کی طرح دل کی سرزمین پر برستا ہے۔ پاکیزہ دل اسے قبول کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں معرفت کے حسین پھول اور تقویٰ کے لذیذ پھل اس میں اگنے لگتے ہیں جبکہ ناپاک دلوں پر اس کا مناسب اثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ سب لوگوں پر انبیاء کی دعوت اور اسلامی تعلیمات کا ایک جیسا اثر

نہیں ہوتا تو اس کی وجہ فاعلیت کا نقص نہیں بلکہ قابلیت میں نقص ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس مثال کا مقصد یہ بات سمجھانا ہے کہ ہمیشہ نیکی اور برائی کی جستجو اس کی مناسب جگہ سے کرنی چاہیے، اس لیے کہ نامناسب جگہ پر جستجو کا نتیجہ توانائی کے ضیاع کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

اس آیت کے بارے میں تیسرا احتمال بھی موجود ہے جو ہماری بحث میں مفید واقع ہوسکتا ہے۔ وہ یہ کہ انسانوں کو نباتات اوران کے ماحول کو زمین سے تشبیہ دی گئی ہے۔ برائی سے آلودہ ماحول میں پاکیزہ انسانوں کی پرورش مشکل ہے، خواہ تعلیمات کتنی ہی طاقتور اور موثر ہوں۔ جس طرح بارش کے قطروں کے بری زمین میں برسنے سے خوبصورت پودے نہیں اگتے، لہٰذا تہذیب نفس اور اخلاق صالح کی پختگی کے لیے ماحول کی اصلاح کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

البتہ مندرجہ بالا تینوں مطالب کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور ممکن ہے کہ یہ تینوں باتیں اس تمثیل کے پیش نظر ہوں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ برائی سے آلودہ معاشرتی ماحول اخلاقی فضائل کا دشمن ہوتا ہے جبکہ پاکیزہ ماحول تہذیب وتزکیہ نفس کے لیے بہترین اور مناسب ترین حالات فراہم کرتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک دن رسولؐ اللہ نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

ایاکم وخضراء الدمن، قیل یارسول اللہ و من خضراء الدمن قال: المرائۃ الحسناء فی منبت السوء

''کوڑے کے ڈھیر پر اگنے والے خوبصورت پودوں سے اجتناب کرو۔ صحابہ نے کہا: یارسولؐ اللہ! آپ کا اشارہ کس چیز کی طرف ہے؟ آپؐ نے فرمایا: برے ماحول میں پرورش پانے والی حسین عورت۔'' (وسائل الشیعہ، ۱۴:۱۹، بحارالانوار، ۱۰۰:۲۳۲)

یہ تشبیہ انسان کی شخصیت پر اچھے یا برے ماحول کی تاثیر اور مسئلہ وراثت کی طرف ایک واضح اشارہ ہے۔

دوسری آیت میں بنی اسرائیل کا ذکر ہے جو مسلسل کئی سال تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی روحانی اور معنوی تعلیمات اور توحید و دیگر اسلامی عقائد کے ماحول میں رہتے رہے۔ انہوں نے دریا کے پھٹ جانے، فرعون کے چنگل سے آزادی پانے اور اس قسم کے دیگر کئی معجزے بھی دیکھے۔ مگر جیسے ہی انہوں نے ایک بت پرست قوم کو دیکھا تو ان سے متاثر ہو گئے اور کہنے لگے:

''اے موسیٰ! ہمیں بھی ان کے خداؤں جیسا ایک خدا بنا دو۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی اس بات سے سخت برہم ہوئے اور کہنے لگے کہ واقعی تم جاہل اور نادان قوم ہو۔ پھر انہوں نے بت پرستی کی برائیاں ان کے لیے بیان کیں۔

حیرت کی بات ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے حقائق کی واضح تشریح کے باوجود اس ماحول کا منفی اور زہریلا اثر

ان کے اندر باقی رہ گیا اور سامری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک طلائی بت بنا لیا اور ان جاہلوں کی اکثریت کو اپنے پیچھے لگا کر توحید سے گمراہ کر کے شرک کی راہ پر لے آیا۔

یہاں سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ بگڑا ہوا ماحول اخلاقی مسائل، حتیٰ کہ اعتقادی مسائل پر کس حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ اس واقعہ کے رونما ہونے سے پہلے عرصہ دراز تک مصر کے بت پرستوں کے ساتھ اکٹھے رہنے کی وجہ سے بنی اسرائیل میں اس قسم کے فکری رجحانات پیدا ہو گئے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے بت پرستی کا منظر دیکھا تو ان کے ان رجحانات میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ بہر حال یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ ماحول انسان کے افکار و عقائد پر اثر انداز ہوتا ہے۔

تیسری آیت حضرت نوح علیہ السلام کی اپنی بت پرست قوم کے خلاف بد دعا کے ذکر پر مشتمل ہے جو اس بات کی ایک اور دلیل ہے کہ ماحول انسان کے اخلاق و عقائد پر اثر انداز ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنی بد دعا کے اختتام پر یہ استدلال کرتے ہیں کہ:

''یا اللہ! اگر تو نے انہیں زندہ چھوڑ دیا تو یہ فاجروں اور کافروں کے سوا کسی کو جنم نہیں دیں گے۔''

یعنی یہ لوگ خود تو کافر اور گمراہ ہیں ہی مگر ان کے بنائے ہوئے ماحول میں پرورش پانے والی آئندہ نسلیں بھی فاجر اور کافر ہی بنیں گی۔

چوتھی اور پانچویں آیت میں برائی سے آلودہ ماحول سے ہجرت کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ چوتھی آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ میری زمین بہت وسیع ہے اور تم صرف میری ہی بندگی کرو (اور کفر و شرک سے آلودہ ماحول میں دشمنوں کے دباؤ کے سامنے نہ جھکو)۔

پانچویں آیت میں ان لوگوں سے خطاب ہے جو ایمان لائے مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی۔ انہیں خبردار کیا جا رہا ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں ان کا کوئی عذر قبول نہیں کیا جائے گا۔ آیت یہ کہہ رہی ہے:

''جن لوگوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، جب فرشتے ان کی روح قبض کریں گے تو ان سے کہیں گے کہ (مسلمان ہوتے ہوئے تم کفار کی صف میں کیوں کھڑے تھے) وہ جواب دیں گے کہ ہم اپنے وطن میں سخت دباؤ میں تھے، فرشتے ان سے کہیں گے کہ اللہ کی زمین اتنی وسیع تھی تو تم نے ہجرت کیوں نہ کی؟ (ان کے پاس کوئی عذر نہ ہوگا اور وہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوں گے)۔''

ہجرت کا مسئلہ اسلام کے بنیادی ترین مسائل میں سے ہے، یہاں تک کہ اسلام کی تاریخ کی بنیاد بھی ہجرت کو ہی قرار دیا گیا ہے۔ ہجرت میں کئی حکمتیں پوشیدہ ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ اس کے ذریعے انسان برائی سے آلودہ ماحول اور اس کے منفی اثرات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

بعض لوگوں کے نادرست تصور کے خلاف ہجرت صرف ابتدائے اسلام کے دور سے مختص نہ تھی بلکہ جب بھی اور جہاں بھی مسلمان یہ محسوس کریں کہ کفر و شرک اور گناہ سے آلودہ ماحول میں رہنے سے ان کے عقائد و اخلاق کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں تو ان پر

واجب ہے کہ وہاں سے ہجرت کر جائیں۔ایک حدیث میں رسولؐ اللہ کا ارشاد ہے:

من فربدینه من ارض الی ارض و ان کان شبرا من الارض استوجب الجنة و کان رفیق محمد(ص) و ابراهیم

''اگر کوئی اپنے دین کی حفاظت کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا جائے،خواہ ایک بالشت کے فاصلہ پر،تو وہ جنت کا حقدار بن جاتا ہے اور وہ محمد وابراہیم علیہما السلام کا ہم نشین ہوگا۔''

(نورالثقلین،۱:۵۴۱)

ایک بالشت کی مقدار کا ذکر اس مسئلہ کی غیر معمولی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی کوئی شخص ہجرت کرے گا،اس میں رسولؐ اللہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شباہت پیدا ہو جائے گی۔

مختصر یہ کہ ہر دور میں،معاشرتی ماحول انسان کو بنانے اور بگاڑنے میں موثر کردار ادا کرتا ہے۔اگرچہ اس میں جبر کا عنصر نہیں پایا جاتا ہے۔بنابرایں اخلاق کی پاکیزگی اور ملکات فاضلہ کی پرورش کے لیے ماحول کی پاکیزگی پر توجہ دینا اس سلسلہ کے اہم ترین امور میں سے ایک ہے۔

اگر ماحول اس قدر خراب ہو چکا ہو کہ اس کو ٹھیک کرنا ممکن نہ ہو تو ایسے ماحول سے ہجرت کرنا ضروری ہے۔جب کسی انسان کا دنیوی اور مادی مستقبل خطرے میں ہو تو وہاں سے ہجرت کر جاتا ہے لیکن جب اس کا معنوی،مذہبی اور اخلاقی مستقبل خطرے میں ہو تو وہ ہجرت نہیں کرتا اور اس کا جواز یہ پیش کرتا ہے کہ اپنے وطن کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟اس طرح وہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو ان برائیوں سے آلودہ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔

تمام علمائے اخلاق پر لازم ہے کہ اخلاقی فضائل کی پرورش کے لیے ماحول کی پاکیزگی کے لیے منصوبہ بندی کریں کیونکہ اس کے بغیر کی جانے والی تمام کوششیں بے اثر نہیں تو کم اثر ضرور ہو جائیں گی۔

۲۔صحبت کا اثر

ایک اور عامل جس کی تاثیر تجربے سے ثابت ہو چکی ہے اور علمائے علم اخلاق و ماہرین تعلیم و تربیت بھی اس پر متفق ہیں، صحبت اور دوستی کا مسئلہ ہے۔عام طور پر دوست اور ساتھی پاکیزہ افراد کے آلودہ ہونے کا سبب بن جاتے ہیں۔اس کے برعکس پاکیزہ افراد بھی اپنے مضبوط ارادے کی بدولت ناپاک افراد کو پاکیزگی اور تقویٰ کی دعوت دیتے ہیں۔اس مختصر اشارے کے ساتھ ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان آیات پر نظر ڈالتے ہیں جو اس مسئلہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

۱۔ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ

بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ﴿۳۸﴾

''جوکوئی رحمٰن کے ذکر سے منہ موڑے گا، ہم شیطان کو اس کے پیچھے چھوڑ دیتے ہیں جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے اور وہ (شیاطین) ایسے لوگوں کو اللہ کی یاد سے روک دیتے ہیں جبکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہی حقیقی ہدایت یافتہ ہیں۔ جب قیامت کے دن وہ ہماری بارگاہ میں حاضر ہوں گے تو کہیں گے کہ کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق ومغرب جیسا فاصلہ ہوتا، تو کس قدر برا ہم نشین تھا۔''

(زخرف:۳۶، ۳۷، ۳۸)

۲۔ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ﴿۵۱﴾ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ﴿۵۲﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ﴿۵۳﴾ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ﴿۵۵﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ﴿۵۶﴾ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ﴿۵۷﴾

''ان میں سے ایک کہے گا کہ میرا ایک دوست تھا جو یہ کہا کرتا تھا کہ کیا تو بھی اس بات کو سچ سمجھتا ہے کہ جب ہم مر کر مٹی اور ہڈیاں ہو گئے تو کیا دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور ہمیں جزا دی جائے گی۔ کیا تم اس کی خبر لینا چاہتے ہو، یہاں سے جہاں تم دیکھ رہے ہو، پھر اچانک وہ اسے جہنم میں دیکھے گا تو کہے گا اللہ کی قسم! تو تو مجھے ہلاک کرنے والا تھا۔ اگر میرے رب کی مہربانی نہ ہوتی تو میں بھی اس وقت جہنم میں ہوتا۔'' (صافات:۵۱ تا ۵۷)

۳۔ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا﴿۲۹﴾

''جس دن ظالم حسرت کی شدت کی وجہ سے اپنے ہاتھ چبائے گا اور کہے گا: کاش میں نے رسول کے ساتھ راستہ اختیار کیا ہوتا۔ کاش میں نے فلاں (گمراہ شخص) کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس نے مجھے اللہ کی یاد سے روک دیا حالانکہ اللہ کی یاد میرے پاس آ چکی تھی۔ شیطان ہمیشہ ہی انسان کو ذلیل کرتا ہے۔''

(فرقان:۲۷، ۲۸، ۲۹)

تفسیر اور نتیجہ

مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت اگرچہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو اللہ کی یاد سے غافل ہونے کی وجہ سے شیطان کی ہم نشینی میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔لیکن یہ آیت انسان کے اخلاق اور انجام پر، بری صحبت کے اثرات کو واضح کرتی ہے۔

ابتداء میں یہ آیت کہتی ہے:

''جو کوئی اللہ کی یاد سے روگردانی کرے گا، ہم اس پر شیطان کو مسلط کر دیں گے جو ہمیشہ اس کے ساتھ اور اس کا ہم نشین بن کر رہے گا۔''

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾

اس کے بعد اس برے ہم نشین کے کردار کو اس طرح بیان کرتی ہے کہ وہ شیاطین اللہ کی طرف جانے کا راستہ ان پر بند کر دیتے ہیں اور انہیں اس مقدس مقصد کی طرف بڑھنے سے روک دیتے ہیں۔ان سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ یہ گمراہ لوگ، گمراہ ہوتے ہوئے اپنے آپ کو ہدایت یافتہ سمجھتے ہیں:

وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾

پھر اس سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہتی ہے:''قیامت کے دن جب سب اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے، پردے ہٹ جائیں گے اور حقائق آشکار ہو جائیں گے تو وہ کہے گا کاش! میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب جتنا فاصلہ ہوتا، تو کس قدر برا ہم نشین ہے۔''

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾

ان بیانات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ برے ساتھی انسان کو مکمل طور پر اللہ کی راہ سے منحرف کر سکتے ہیں۔یہ اس کے اخلاق کی بنیادوں کو تباہ کر سکتے ہیں اور حقائق کو اس طرح ان کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ وہ عین گمراہی میں ہوتے ہوئے خود کو ہدایت پر سمجھتے ہیں۔یہ بات یقینی ہے کہ جب انسان کی یہ حالت ہو جائے تو صراطِ مستقیم کی طرف اس کی واپسی ناممکن ہو جاتی ہے اور وہ اس وقت بیدار ہوتا ہے جب سارے راستے اس پر بند ہو چکے ہوتے ہیں۔

آیات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ برا ہم نشین آخرت میں بھی اس کا ہم نشین ہوتا ہے اور یہ کس قدر بدقسمتی کی بات ہے کہ جو شخص انسان کی ہلاکت کا سبب بنا ہو، وہ ہر وقت اس کے ساتھ موجود ہو اور اسے کہا جائے کہ اب تم اس سے جدا ہونے کی آرزو نہ کرو، تم سب کا انجام ایک ہے:

وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾

''اور (ان سے کہا جائے گا کہ) جبکہ تم (دنیا میں) کفر کر چکے تھے تو آج یہ بات تمہارے کام نہ آئے

گی کہ (تم اور شیاطین) سب عذاب میں شریک ہو۔'' (زخرف:۳۹)

انہی آیات سے مشابہ سورۂ فصلت کی آیت ۲۵ ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ۝۲۵

''ہم نے ان کے لیے برے ہم نشین مقرر کر دیئے جنہوں نے پیچھے سے اور آگے سے برائیوں کو آراستہ کر کے انہیں دکھایا۔ اللہ کا فرمان ان کے بارے میں وقوع پذیر ہوا اور اپنے سے پہلے جن وانس کے گمراہوں کے انجام سے دوچار ہو گئے، یقیناوہ خسارہ اٹھانے والے تھے۔''

دوسرے حصے کی آیات میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے برے ہم نشین ہمیشہ انہیں گمراہ کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر وہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اپنی کوشش کے نتیجہ میں ان کے دام سے بچ جاتے ہیں، حالانکہ وہ ہلاکت کی سرحدوں تک آگے جا چکے ہوتے ہیں۔ ان آیات میں بھی انسان کے عقائد و اخلاق پر بری صحبت کے برے اثرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ بری صحبت انسان کو برا بننے پر مجبور کر دے بلکہ ممکن ہے کہ انسان اپنی کوشش کے نتیجہ میں اپنے آپ کو بچالے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قیامت کے دن کچھ اہل بہشت اپنے ساتھیوں سے کہیں گے کہ دنیا میں میرا ایک دوست تھا جو مجھے یہ کہتا رہتا تھا کہ کیا تم بھی ان باتوں کو سچ جانتے ہو کہ جب ہم مر کر مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ زندہ ہوں گے اور اپنے اعمال کا بدلہ پائیں گے؟ (لیکن اللہ کے فضل سے میں اس کی باتوں میں نہیں آیا اور اپنے ایمان پر ثابت قدم رہا)۔ صافات، ۵۰ تا ۵۳

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ۝۵۰ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ۝۵۱ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ۝۵۲ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ۝۵۳

اس موقع پر وہ اپنے اس پرانے اور نالائق دوست کی جستجو کرتا ہے اور جنت کی بلندی سے دوزخ کی طرف دیکھتا ہے تو اس کا وہ دوست جہنم میں غوطے کھاتا نظر آتا ہے:

فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ۝۵۵

اسے دیکھ کر وہ اسے کہتا ہے کہ خدا کی قسم! تو مجھے ہلاک کر دینے والا تھا جس طرح تو خود ہلاک اور بدبخت ہو گیا ہے۔ اگر میرے رب کا فضل وکرم میرے شامل حال نہ ہوتا تو آج میں بھی دوزخ میں ہوتا:

قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ۝۵۶ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ۝۵۷

ان آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ برا ساتھی انسان کو جہنم کے کنارے تک لے جاتا ہے۔ اگر انسان کا ایمان

پختہ نہ ہو، اس میں تقویٰ نہ ہو اور اللہ کا فضل وکرم اس کے شامل حال نہ ہو تو وہ جہنم میں جا گرتا ہے۔

آیات کے تیسرے گروہ میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن ظالم برے اور نالائق دوستوں کے انتخاب پر سخت افسوس کریں گے، اس لیے کہ ان پر واضح ہو چکا ہوگا کہ ان کی بدبختی کی اصل وجہ ان کی یہی دوستی تھی۔ اس دن ظالم حسرت اور پشیمانی کی شدت سے اپنے دانتوں سے اپنا ہاتھ چبائے گا اور کہے گا کہ کاش! میں نے رسول کے ساتھ راستہ اختیار کیا ہوتا، کاش میں نے فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس نے اللہ کا ذکر میرے پاس آ جانے کے بعد بھی مجھے گمراہ کر دیا اور شیطان تو ہمیشہ انسان کو ذلیل کرنے والا ہے:

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾

اس طرح قیامت کے دن ظالم سب سے پہلے اس بات پر شدید پچھتاوے کا شکار ہوں گے کہ انہوں نے رسولؐ کا راستہ کیوں ترک کیا! اس کے بعد وہ برے لوگوں سے تعلق قائم کرنے کا اعتراف کرتا ہے اور اسی تعلق کو اپنی گمراہی کا اصل سبب قرار دیتا ہے، یہاں تک کہ ان کی تاثیر کو، انبیاء کی تاثیر سے زیادہ قوی قرار دیتا ہے (البتہ یہ بیمار دلوں کا معاملہ ہے)۔

آخری جملے سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ برے دوست شیطان کا لشکر ہوتے ہیں جنہیں شیاطین انس کہا جاتا ہے۔

یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ان آیات میں ظالم کی پشیمانی کے بیان کے لیے:

يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ

''ظالم اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹے گا۔''

کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ افسوس اور پچھتاوے کی آخری منزل کا بیان کرتے ہیں۔

عام طور پر انسان افسوس وندامت کے اظہار کے لیے اپنی انگلی دانتوں میں دبا لیتا ہے۔ اس سے اگلے مرحلہ پر اپنے ہاتھ کی پشت پر کاٹتا ہے اور افسوس وندامت کے آخری مرحلہ پر یکے بعد دیگرے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹتا ہے۔ درحقیقت اس طرح وہ اپنے آپ سے انتقام لیتا ہے کہ اس نے کیوں کوتاہی کی اور کیوں اپنے ہاتھوں سے اپنی ہلاکت اور بدبختی کے اسباب فراہم کیے۔

ان آیات میں اور بعض دیگر آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کے دوست اور ہم نشین اس کی سعادت اور ہلاکت میں غیر معمولی کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ انسان کے اخلاق اور کردار پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ اس کے عقائد کی تشکیل میں بھی موثر ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بات بہت ضروری ہے کہ ایک معلم اخلاق اپنے زیر تربیت افراد پر اس پہلو سے خصوصی توجہ دے۔ خاص طور پر دور حاضر میں، جبکہ نالائق دوستوں کے ذریعے برائی پھیلانے کے اسباب وحشت ناک صورت اختیار

کر چکے ہیں اور مختلف قسم کی اخلاقی برائیوں کا اصل سبب بن چکے ہیں۔

دوستوں کا کردار احادیث کی روشنی میں

اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی بہت واضح احادیث موجود ہیں۔ رسولؐ اللہ کی ایک حدیث میں اس مسئلہ کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ آپؐ فرماتے ہیں:

المرء علی دین خلیله و قرینه

''انسان اپنے دوست اور ہم نشین کے دین پر ہوتا ہے۔'' (اصول کافی، ۲:۵ ۷ ۳)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے یہ بات ایک اور انداز میں اس طرح بیان فرمائی ہے:

لا تصحبوا اهل البدع ولا تجالسوهم فتصیر واعند الناس کواحد منهم قال رسول الله (ص) المرء علی دین خلیله وقرینه

''اہل بدعت سے دوستی نہ کرو اور ان کے ہم نشین نہ بنو، اس لیے کہ تم لوگوں کے ہاں انہی میں شمار کیے جاؤ گے، رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ انسان اپنے دوست اور ہم نشین کے دین پر ہوتا ہے۔'' (مذکورہ حوالہ)

ایک اور حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام دوستوں کے ایک دوسرے پر اثر کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

مجالسة الاخیار تلحق الاشرار بالاخیار و مجالسة الفجار تلحق الابرار بالفجار

''نیک لوگوں کی صحبت، برے لوگوں کو نیکوں سے ملا دیتی ہے اور برے لوگوں کی صحبت نیک لوگوں کو برے لوگوں سے ملحق کر دیتی ہے۔'' (صفات الشیعہ از شیخ صدوق بمطابق نقل از بحارالانوار، ۱۹۷:۷۱)

اسی حدیث کے ذیل میں ایک نہایت پر معنی جملے میں کہا گیا ہے:

فمن اشتبه علیکم امره ولم تعرفوا دینه فانظروا الی خلطائه

''اگر کسی شخص کا حال تم پر واضح نہ ہو اور تم اس کی دینداری کی کیفیت کو نہ جانتے ہو تو اس کے دوستوں کو دیکھو'' (یعنی اگر اس کے دوست اللہ سے محبت کرنے والے ہوں تو سمجھ لو کہ وہ مومن ہے اور اگر اس کی ہم نشینی حق کے دشمنوں سے ہے تو سمجھ لو کہ وہ بھی برا شخص ہے)۔

بعض روایات میں اس حقیقت کو اس تشبیہ سے واضح کیا گیا ہے:

صحبة الاشرار تکسب الشر کالریح اذا مرت بالنتن حملت نتنا

''برے لوگوں کی صحبت سے برائی حاصل ہوتی ہے، جس طرح ہوا گندگی کے پاس سے گزرتی ہے تو بدبودار ہوجاتی ہے۔'' (غررالحکم)

ان بیانات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ جس طرح برے لوگوں کی صحبت برائی کا راستہ ہموار کرتی ہے، اسی طرح اچھے لوگوں کی صحبت، ہدایت اور اخلاقی فضائل کی روشنی کو انسان کے دل میں زیادہ کردیتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے:

عمارة القلوب فی معاشرة ذوی العقول

''اہل عقل کی صحبت دلوں کو آباد کرتی ہے۔'' (غررالحکم)

نیز آپؑ سے ہی مروی ایک اور حدیث میں ہے:

معاشرة ذوی الفضائل حیاة القلوب

''اہل فضائل کی ہم نشینی دلوں کو زندہ کرتی ہے۔'' (غررالحکم)

دوستوں اور ہم نشینوں کا انسان کی باطنی خصوصیات پر کتنا گہرا اثر ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کہتے تھے:

لا تحکموا علی رجل بشیء حتی تنظروا الی من یصاحب فانما یعرف الرجل باشکاله و اقرانه، وینسب الی اصحابه و اخدانه

''کسی شخص کے بارے میں اس وقت تک فیصلہ نہ کرو جب تک اس کے دوستوں کے بارے میں معلوم نہ کرلو۔ اس لیے کہ انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا اور انہی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔'' (بحارالانوار، ۱۷:۱۸۸)

حضرت لقمان ایک خوبصورت حدیث میں اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں:

یابنی صاحب العلماء، واقرب منهم، وجالسهم وزرهم فی بیوتهم، فلعلك تشبههم فتکون معهم

''اے بیٹا! اہل علم سے دوستی کرو اور ان کے نزدیک رہو۔ ان کے گھر آمد و رفت رکھو تاکہ ان جیسے ہوجاؤ اور (دنیا اور آخرت میں) ان کے ساتھ رہو۔'' (غررالحکم)

مختصر یہ کہ احادیث میں دوستوں کے ایک دوسرے کے اخلاق پر اثر کے بارے میں بہت زیادہ اور پر معنی ارشادات موجود ہیں۔ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک وسیع مضمون تیار ہوسکتا ہے۔

اس بحث کا اختتام حضرت علی علیہ السلام کی اس مختصر مگر پر معنی حدیث پر کرتے ہیں، اس حدیث میں آپؑ اپنے فرزندِ عزیز حضرت امام حسن علیہ السلام کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قارن اهل الخير، تكن منهم، وباين اهل الشر تبن عنهم

''اہل خیر کے قریب رہو، ان میں شامل ہوجاؤ گے۔ اہل شر سے دور رہو تا کہ ان کی برائی سے دور رہو۔''

(نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱)

صحبت کا اثر منطق کی روشنی میں

کہا جاتا ہے کہ کسی چیز کے امکان کی بہترین دلیل اس کا وقوع ہے۔ جس موضوع پر ہم گفتگو کر رہے ہیں، اس کے صحیح ہونے کی بہترین دلیل وہ عملی نمونے ہیں جنہیں ہم اپنے معاشرے میں دیکھتے ہیں کہ برے لوگوں کی صحبت انسان کو برا بنا دیتی ہے اور اچھے لوگوں کی صحبت انسان کی روح کی پاکیزگی اور نورانیت کا سبب بنتی ہے۔

پرانی کہاوت ہے کہ بری اخلاقی خصوصیات متعدی بیماریوں کی مانند ہوتی ہیں جو تیزی سے دوستوں اور ہم نشینوں میں منتقل ہوجاتی ہے، خاص طور پر اگر انسان کم عمر ہو، اس کی معلومات کم ہوں، ایمان وعقائد کمزور ہوں تو دوسروں کی اخلاقی خصوصیات زیادہ تیزی سے انسان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ایسے افراد سے میل جول انسان کے لیے زہر قاتل ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ اچھے یا برے افراد کا انجام دوستوں اور ہم نشینوں کے بدل جانے سے مکمل طور پر بدل جاتا ہے اور ان کی زندگی کے تمام اطوار و انداز بدل جاتے ہیں۔ اس بات کی متعدد نفسیاتی وجوہات ہیں:

۱۔ ماہرین نفسیات اپنی تحقیقات میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان کے اندر نقالی یا بالفاظ دیگر تقلید کا رجحان پایا جاتا ہے۔ یعنی لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے دوستوں اور اقرباء کے افعال کی نقالی یا تقلید کرتے ہیں۔ ہنس مکھ لوگ اپنے دوستوں اور ساتھیوں میں ہنسی بکھیرتے ہیں جبکہ افسردہ افراد انجمن کو افسردہ کر دیتے ہیں۔

جو لوگ مایوس ہوتے ہیں، وہ اپنے دوستوں کو بھی مایوس کرتے ہیں۔ منفی سوچ رکھنے والے اپنے دوستوں کی سوچ کو بھی منفی بنا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوستوں کی خصوصیات ایک دوسرے پر تیزی سے اثر انداز ہوتی ہیں۔

۲۔ برائی کا مشاہدہ اور اس کا تکرار اس کی برائی کو کم کر دیتا ہے اور آہستہ آہستہ اسے ایک عام چیز بنا دیتا ہے۔ ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ گناہوں کو ترک کرنے کا ایک موثر سبب ان کے برا ہونے کا احساس ہے۔

۳۔ انسانوں پر تلقین کے اثر کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ برے دوست عام طور پر اپنے دوستوں پر تلقین کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بدترین اعمال ان کی نظر میں اچھے نظر آنے لگتے ہیں اور ان میں اچھائی اور برائی کی تمیز کے معیار بالکل گر جاتے ہیں۔

۴۔ برے لوگوں کی صحبت انسان کے اندر منفی سوچ کو مضبوط کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر ایک کے بارے میں بدگمان ہو جاتا ہے۔ یہ بدگمانی اخلاقی فساد کی دلدل میں گر جانے کا ایک اہم سبب بنتی ہے۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

مجالسة الاشرار تورث سوء الظن بالاخیار

''برے لوگوں کی صحبت انسان کو اچھے لوگوں کے بارے میں بدگمان کر دیتی ہے۔'' (بحار، ۷۱: ۱۹۷)

ایک اور حدیث میں برے لوگوں کی ہم نشینی کو دل کی موت کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ اس حدیث میں ہے:

اربع یمتن القلب ..... ومجالسة الموتی، فقیل له یارسول الله و ما الموتی؟ قال (ص) کل غنی مسرف

''چار چیزیں دل کو مردہ کر دیتی ہیں جن میں سے ایک مردوں کی ہم نشینی ہے۔ پوچھا گیا کہ یارسولؐ اللہ! مردے کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ہر دولت مند اسرافِ کار''۔ (بحار الانوار، ۷۱: ۱۹۵)

دوستوں کی اچھی یا بری صفات کے ایک دوسرے میں منتقل ہونے کے بارے میں شعراء و ادباء نے بھی دادِ سخن دی ہے:

کم نشیں بابدان کہ صحبت بد
گرچہ پاکی ترا پلید کند

(برے لوگوں کے ساتھ کم بیٹھو کیونکہ وہ تمہیں پلید کر دیں گے، خواہ تم پاک ہو)

آفتاب ارچہ روشن است آنرا
پارہ ای ابر ناپدید کند

(سورج اگرچہ روشن ہے مگر بادل کا ایک ٹکڑا اسے چھپا دیتا ہے)

بابدان کم نشین کہ بدمانی
خو پذیراست نفس انسانی

(برے لوگوں کے ساتھ کم بیٹھو، کیونکہ نفس انسانی دوسروں کی عادات کو قبول کرتا ہے)

صحبت نیک راز دست مدہ
کہ ومہ بہہ شود ز صحبت بہ

(اچھے لوگوں کی صحبت کو ترک نہ کرو کیونکہ اچھے لوگوں کی صحبت سے لوگ اچھے ہو جاتے ہیں)

اس سلسلہ میں اشعار تو بہت زیادہ ہیں، ہم اس بحث کو شیخ سعدی کے ان اشعار پر ختم کرتے ہیں:

گلی خوشبوی درحمام روزی
رسید از دست محبوبی بدستم
(ایک روز حمام میں خوشبودار مٹی کسی محبوب کی طرف سے میرے ہاتھ میں آئی)
بدوگفتم کہ مشکی یا عبیری
کہ از بوئے دل آویز تومستم
(میں نے اس سے کہا تم مشک ہو یا عبیر کیونکہ میں تمہاری خوشبو سے مدہوش ہو گیا ہوں)
بگفتا من گلی ناچیز بودم
ولیکن مدتی باگل نشستم
(اس نے کہا کہ میں ناچیز مٹی تھی لیکن کچھ عرصہ پھول کی صحبت میں رہی)
کمال ہم نشین درمن اثر کرد
وگرنہ من ہمان خاکم کہ ہستم
(میرے ہم نشین کے کمال نے مجھ پر اثر کیا ورنہ میں وہی مٹی ہوں جو نظر آ رہی ہوں)

۳۔اخلاق پر خاندانی تربیت وراثت کا اثر

ہم سب جانتے ہیں کہ بچے کی پہلی تربیت گاہ گھر کا ماحول ہوتا ہے۔ بہت سی اخلاقی خصوصیات خاندان میں ہی نشوونما پاتی ہیں۔ خاندان کا اچھا یا برا ماحول اخلاقی فضائل کی پرورش میں بہت موثر واقع ہوتا ہے بلکہ اسے انسان کے اخلاق کی عمارت کا سنگ بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچہ بہت جلدی اثر قبول کرتا ہے اور بچپن میں جو چیزیں اس کی روح پر اثر انداز ہوتی ہیں، وہ ہمیشہ باقی رہتی ہیں۔

اس بات کو حضرت علی علیہ السلام نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

العلم (فی) الصغر کالنقش فی الحجر

''بچپن کی تعلیم پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔'' (بحار الانوار، ۱: ۲۲۴)

بچہ اپنے ماں باپ اور بڑے بھائی بہنوں سے بہت سی اخلاقی خصوصیات سیکھتا ہے۔ شجاعت، سخاوت، صداقت، امانت اور ان جیسی دیگر صفات بچے بڑی آسانی سے اپنے بڑوں سے سیکھ جاتے ہیں۔ اسی طرح جھوٹ، خیانت، بے راہ روی اور ایسے ہی اخلاقی رذائل بھی بچوں کے اندر بڑوں سے ہی آتے ہیں۔

اس کے علاوہ ماں باپ کی اخلاقی خصوصیات، وراثت کے ذریعے بھی بچوں میں منتقل ہوتی ہیں۔ جینز کے ذریعے والدین کی

جسمانی خصوصیات کے ساتھ ان کی اخلاقی خصوصیات بھی بچوں میں منتقل ہوتی ہیں۔ اگر چہ ان کی تاثیر سو فیصد نہیں ہوتی اور بچہ ان کی وجہ سے مجبور نہیں ہوتا، بلکہ ان میں تبدیلی بھی ممکن ہوتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں ماں باپ دو طرح سے اپنے بچوں کے اخلاق پر اثر انداز ہوتے ہیں جنہیں تکوین اور تشریع کا نام دیا جا سکتا ہے۔ تکوین سے مراد وہ اخلاقی خصوصیات ہیں جو نطفہ میں پوشیدہ ہیں اور غیر شعوری طور پر بچوں میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ تشریع سے مراد وہ تعلیم و تربیت ہے جو شعوری طور پر انجام پاتی ہے اور اچھی یا بری اخلاقی صفات کی بنیاد بنتی ہے۔

اگر چہ ان دونوں میں جبر کا عنصر نہیں پایا جاتا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ انسان کی صفات اور باطنی کیفیات کی زمین ضرور ہموار کرتی ہیں۔ اس بات کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ پاک، صالح، شجاع اور مہربان افراد کے بچے بھی انہی کی مانند ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ آلودہ افراد کے بچے بھی آلودہ ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں اقسام کی مثالوں میں استثناء بھی پایا جاتا ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وراثت و تربیت کا اثر جبری نہیں ہے۔ اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن مجید کی ان آیات کی طرف رجوع کرتے ہیں جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

۱۔ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾

''اس لیے کہ اگر تو نے انہیں باقی رکھا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور صرف فاجر اور کافر نسل کو جنم دیں گے۔'' (نوح)

۲۔ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ؕ

''اللہ نے اسے (مریم کو) عمدہ انداز میں قبول فرمایا اور اس کی اچھی پرورش کی اور اس کی کفالت کی ذمہ داری ذکریا کو سونپی۔'' (آل عمران: ۳۷)

۳۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾

''اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہانوں پر برتری عطا فرمائی۔ وہ ایسی نسل کے لوگ تھے جو (تقویٰ اور پاکیزگی میں) ایک دوسرے سے تھے اور اللہ سننے، جاننے والا ہے۔''

۴۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ

''اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو جہنم کی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔'' (تحریم: ۶)

۵۔ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿۲۸﴾

''اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ بدچلن آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکردار تھی۔'' (مریم:۲۸)

تفسیر ونتیجہ

پہلی آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا ذکر ہے۔ حضرت نوحؑ نے ان کی تباہی کے لیے عذاب کی دعا کرتے ہوئے یہ دلیل بھی بیان کی کہ اگر یہ قوم باقی رہی تو دوسروں کو بھی گمراہ کرے گی اور ان سے صرف فاجر اور کافر نسل ہی جنم لے گی:

اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ فاسد اور مفسد افراد جن کی نسلیں بھی فاسد اور مفسد ہوتی ہیں، انہیں جینے کا حق بھی حاصل نہیں ہے۔ انہیں عذاب الٰہی میں گرفتار ہوکر نیست و نابود ہوجانا چاہیے۔ یہ آیت اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ معاشرتی ماحول، خاندانی تربیت اور وراثت بھی اخلاق وعقائد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

یہ نکتہ قابل غور ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام دوٹوک الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ ان کی ساری نسل فاسد اور کافر ہوگی، اس لیے کہ ان کے معاشرے میں برائی کی موج اس قدر طاقتور تھی کہ اس کے اثر سے نجات حاصل کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کا جبری اثر سو فیصد اور یقینی ہوتا ہے اور انسان بے اختیار اس کی طرف مائل ہوجائے۔

بعض علماء کا یہ کہنا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اس حقیقت کو وحی الٰہی کی روشنی میں جانتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتا دیا تھا کہ:

اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ

''ان میں سے جو اب تک ایمان لا چکے ہیں، ان کے علاوہ اور کوئی ایمان نہیں لائے گا۔'' (ہود:۳۶)

لیکن یہ بات واضح ہے کہ یہ آیت آئندہ نسلوں کے بارے میں بھی ہو۔ لہٰذا بعید از قیاس نہیں ہے کہ انہوں نے آنے والی نسل کے بارے میں یہ فیصلہ مندرجہ بالا تینوں عوامل (ماحول، تربیت اور وراثت) کی بنیاد پر کیا ہو۔

بعض روایات میں ہے کہ قوم نوحؑ کے گمراہ لوگوں کے بچے جب حد بلوغ کو پہنچتے تو وہ انہیں لے کر حضرت نوحؑ کے پاس آتے اور اسے کہتے کہ اس بوڑھے کو دیکھ رہے ہو، یہ ایک جھوٹا شخص ہے، اس سے بچ کر رہنا، میرے باپ نے بھی مجھے یہی نصیحت کی تھی (تم بھی اپنے بچوں کو اسی طرح نصیحت کرنا)۔

اس طرح فاسد نسلیں ایک دوسرے کے بعد آتی تھیں اور چلی جاتی تھیں۔ (فخر رازی اور تفسیر مراغی)

قرآن مجید میں حضرت مریم علیہا السلام، جو کہ دنیا کی معزز ترین اور عظیم ترین خواتین میں سے تھیں، ان کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وراثت، خاندانی تربیت اور ماحول انسان کی روحانی کیفیات پر اثر انداز ہوتے ہیں، لہٰذا پاکدامن اور پاکیزہ بچوں کی پرورش کے لیے ان عوامل کی تاثیر پر ضرور توجہ دی جانی چاہیے۔

ان عوامل میں سے ایک زمانۂ حمل میں ماں کی ذہنی اور روحانی کیفیت ہے جس کی بنیاد پر وہ ہر وقت بچے کو شیطان کے وسوسوں کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے اسے اللہ کی پناہ میں دیتی ہے اور یہ آرزو رکھتی ہے کہ وہ بچہ اللہ کے گھر کے خدمت گزاروں میں سے ہو۔ یہاں تک کہ وہ اس کی منت بھی مان لیتی ہے۔

مندرجہ بالا آیت یہ کہہ رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے احسن انداز میں قبول فرمایا اور اس کی عمدہ پودے کے انداز میں پرورش فرمائی۔

پاکیزہ انسان کو ایک پاکیزہ اور عمدہ پودے سے تشبیہ دینا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح خوبصورت پھول یا اچھے پھل کا پودا حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اچھے بیج کا استعمال کیا جائے، اس کی نشوونما کے لیے مناسب ماحول فراہم کیا جائے اور باغبان مسلسل اس کی دیکھ بھال کرتا رہے، اچھے انسان کی پرورش کے لیے بھی یہ سب کچھ ضروری ہے اور وراثت، ماحول اور خاندانی تربیت کا اس پر گہرا اثر ہوتا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ اس آیت کے ذیل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ؕ

یعنی ''اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کی کفالت کی ذمہ داری حضرت ذکریاؑ کو سونپی۔''

ظاہر سی بات ہے کہ جو حضرت زکریا علیہ السلام جیسے عظیم الشان نبی کی گود میں پلی ہو، اس کی شخصیت پر اس تربیت کا کیسا اثر ہوا ہوگا۔

لہٰذا یہ بات ہرگز قابل تعجب نہیں ہونی چاہیے کہ اس عمدہ تربیت کے نتیجہ میں حضرت مریم ایمان، اخلاق اور تقویٰ میں ایسے مقام پر فائز ہوگئیں جس کی طرف آیت کا یہ حصہ اشارہ کرتا ہے:

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

''جب بھی ذکریاؑ ان کی عبادت گاہ میں داخل ہوتے، ان کے پاس کھانا دیکھتے اور پوچھتے کہ اے مریم! یہ تمہیں کہاں سے ملا؟ وہ جواب دیتیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔''

جی ہاں! جنتی تربیت کا نتیجہ بھی جنتی اخلاق اور جنتی خوراک ہوتا ہے۔

تیسری آیت میں، جو درحقیقت اس آیت کی تمہید ہے جس میں حضرت مریم اور حضرت ذکریا علیہما السلام کے ذریعے ان کی تربیت کا ذکر کیا گیا ہے، پاکیزگی، تقویٰ اور فضیلت کے حصول میں وراثت اور تربیت کے کردار کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾

''اللہ نے آدم، نوح، آلِ ابراہیم اور آل عمران کو اہل عالم پر چن لیا اور برتری دی۔ وہ ایک ایسی نسل کے لوگ تھے (جو پاکیزگی اور فضیلت میں ایک دوسرے سے تھے) اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔''

ان کا ایک دوسرے سے ہونا، وراثت کے عنصر کی طرف اشارہ ہے یا خاندانی تربیت کی طرف یا دونوں کی طرف۔ اس آیت کے ذیل میں جو روایات [1] نقل ہوئی ہیں، ان میں بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ بہرحال یہ آیات ناقابل انکار طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان کا تربیتی ماحول اور اس کی وراثت، ضروری قابلیت اور لیاقت پر اثر ڈالتے ہیں۔ جو افراد ایسی تربیت اور وراثت سے بہرہ مند ہوتے ہیں، ان کا ایسے لوگوں سے موازنہ بھی نہیں کیا جا سکتا جو آلودہ وراثت اور غلط تربیت یافتہ ہوں۔

چوتھی آیت اہل ایمان کو مخاطب کر کے کہہ رہی ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ

یہ آیت سورۂ تحریم کی ابتدائی آیات کے بعد ہے جن میں ازواجِ رسول کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اپنے اعمال پر خصوصی طور پر نظر رکھیں۔ اس کے بعد اس آیت میں یہی بات عمومی انداز میں سب مسلمانوں سے کہی گئی ہے۔

واضح سی بات ہے کہ یہاں آگ سے مراد جہنم کی آگ ہے۔ اس سے دور رکھنا اور بچانا صرف خاندانی تعلیم و تربیت کے ذریعہ ہی ممکن ہے جو گناہوں کو ترک کرنے، نیکیوں کی طرف مائل ہونے اور تقویٰ کا سبب بنتی ہے۔ اس طرح یہ آیت جہاں خاندان کے بارے میں سرپرست کے فرض کی نشاندہی کر رہی ہے، وہاں تقویٰ اور فضائل اخلاقی کے حصول میں تعلیم و تربیت کی تاثیر کو بھی واضح کر رہی ہے۔

تعلیم و تربیت کا لائحہ عمل خاندان کی تشکیل کے سنگ بنیاد یعنی شادی کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بچے کی پیدائش سے لے کر دیگر تمام مراحل میں اسے احتیاط کے ساتھ آگے بڑھانا چاہیے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جب مندرجہ بالا آیات نازل ہوئی تو ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا:

---

[1] نور الثقلین، ۱: ۳۳۱ کی طرف رجوع فرمائیے۔

''یارسولؐ اللہ! میں کس طرح اپنے خاندان کو جہنم کی آگ سے بچاؤں؟''

آپؐ نے فرمایا:

تأمرهم بما امر الله و تنهاهم عما نهاهم الله ان اطاعوك كنت قد وقيتهم، وان عصوك كنت قد قضيت ما عليك

''انہیں امر بالمعروف ونہی ازمنکر کرو۔ اگر وہ قبول کرلیں تو تم نے انہیں آتش جہنم سے بچا لیا اور اگر قبول نہ کریں تو تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔'' (نورالثقلین، ۵:۲۷۳)

یہ نکتہ بھی نہایت واضح ہے کہ امر بالمعروف خاندان کو جہنم سے بچانے کا ایک موثر ذریعہ ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن ذریعہ استعمال کرنا چاہیے اور تمام نفسیاتی، قولی اور عملی پہلوؤں سے استفادہ کرنا چاہیے۔ ممکن ہے یہ آیت وراثت کے مسئلہ پر بھی نظر رکھتی ہو کہ انسان انعقادِ نطفہ کے وقت رزقِ حلال کھائے ہوئے ہو اور یادِ خدا میں مصروف ہوتا کہ پیدا ہونے والا بچہ مثبت وراثت کے ساتھ دنیا میں آئے، اس لیے کہ آتش جہنم سے دور رکھنے میں یہ باتیں بھی شامل ہیں۔

پانچویں اور آخری آیت حضرت مریم اور بغیر باپ کے حضرت عیسیٰ کی ولادت کے واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس آیت میں ہے کہ جب حضرت مریم اپنے نومولود بچے کو لے کر اپنی قوم کے پاس آئیں تو انہوں نے تعجب سے کہا کہ تو نے عجیب برا کام کیا ہے:

''اے ہارون کی بہن! تیرا باپ برا آدمی نہیں تھا، تیری ماں بھی بدکار نہ تھی (پھر تو کیسے شوہر کے بغیر ماں بن گئی؟'')

یہ الفاظ (خاص طور پر اس لیے کہ قرآن مجید نے انہیں نقل کیا ہے اور ان کے صحیح ہونے کی تصدیق کی ہے) اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ماں باپ کی طرف سے وراثت کا عنصر اور اسی طرح خاندانی تربیت، انسان کے اخلاق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے جسے سب لوگ تجربہ کی بنیاد پر جانتے تھے اور اگر اس کے خلاف کوئی چیز رونما ہوتی تو اس پر حیرت کا اظہار کرتے۔

مندرجہ بالا آیات سے بخوبی یہ نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے کہ اخلاقی مسائل میں وراثت اور خاندانی تربیت کے عنصر کا کردار بہت اہم ہے، خواہ یہ کردار مثبت پہلو میں ہو یا منفی میں۔

اخلاق اور خاندانی تربیت احادیث کی روشنی میں

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر انسان کی پہلی درسگاہ دامنِ مادر اور باپ کی آغوش ہوتی ہے۔ اسی درسگاہ میں بچہ فضائل و رذائل کا پہلا سبق سیکھتا ہے۔ اگر تربیت کے مفہوم کا دائرہ تکوینی اور تشریعی تک بڑھا دیا جائے تو پہلا مدرسہ رحم مادر اور صلب پدر ہوتا ہے جو بچے پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی فضیلت اور رذیلت کی راہ ہموار کرتا ہے۔

احادیث میں انتہائی لطیف عبارات میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔نمونے کے طور پر ذیل میں چند احادیث نقل کی جاتی ہیں:

۱۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

حسن الاخلاق برهان كرم الاعراق

''حسن اخلاق انسان کی اچھی وراثت کی دلیل ہے۔'' (غرر الحکم)

یہی وجہ ہے کہ پاکیزہ اور صاحب فضیلت خاندانوں میں زیادہ تر با فضیلت بچے پروان چڑھتے ہیں جبکہ برے افراد عام طور پر برے خاندانوں میں پرورش پاتے ہیں۔

۲۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

عليكم فى طلب الحوائج بشراف النفوس و ذوى الاصول الطيبة فانها عندهم اقضى وهى لديهم ازكى

''اپنی حاجات کی طلب میں ایسے افراد کی طرف رجوع کرو جو شریف النفس ہوں اور انہوں نے پاکیزہ خاندانوں میں پرورش پائی ہو۔ایسے لوگ حاجات کو بہتر اور پاکیزہ طور پر پورا کرتے ہیں۔''

۳۔ حضرت علی علیہ السلام مالک اشتر کے نام عہد نامہ میں قابل افسروں کے انتخاب کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

ثم الصق بذوى المروءات والاحساب و اهل البيوتات الصالحة والسوابق الحسنة ثم اهل النجدة و الشجاعة و السخاء و السماحة فانهم جماع من الكرم و شعب من العرف

''پھر ان لوگوں سے تعلق قائم کرو جو اچھے خاندانوں سے اور اچھے ماضی کے حامل ہوں۔اس کے بعد شجاع، سخی اور بزرگ منش افراد سے تعلق پیدا کرو، اس لیے کہ وہ نیکی اور فضیلت کا مرکز ہیں۔''

۴۔ برے والدین کا اثر بچوں کے اخلاق پر اس حد تک ہوتا ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

ايما امراة اطاعت زوجها وهو شارب الخمر، كان لها من الخطا يابعدد نجوم السماء، وكل مولود يلد منه فهو نجس

''جو عورت شراب خور شوہر کی اطاعت کرے (یعنی اسے ہم بستری کرنے دے) تو وہ آسمان کے ستاروں کی تعداد کے برابر گناہوں کی مرتکب ہوتی ہے اور اس سے جو بچہ پیدا ہوگا وہ نجس ہوگا۔'' (لئالی

الاخبار)

متعدد احادیث میں شراب خور اور بد اخلاق شخص کو رشتہ دینے سے منع کیا گیا ہے۔(وسائل الشیعہ، ۱۴، ۵۴، ۵۵)

۵۔ ماں باپ کی تربیت کا بچوں کی شخصیت پر اتنا گہرا اثر ہوتا ہے کہ مشہور حدیث نبوی میں ہے کہ:

كل مولود يولد على الفطرة حتى يكون ابواه هما اللذان يهودانه و ينصرانه

''ہر نومولود توحید اور اسلام کی پاکیزہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا عیسائی بنا دیتے ہیں۔'' (مجمع البیان، سورۂ روم: ۳۰)

جب خاندانی تربیت ایمان اور عقیدہ کو بدل سکتی ہے تو کیسے ممکن ہے کہ اخلاق پر اثر انداز نہ ہو؟

۶۔ یہی وجہ ہے کہ تربیت کو ماں باپ پر بچے کا بنیادی ترین حق قرار دیا گیا ہے۔حدیث نبویؐ میں ہے:

حق الولد على الوالد ان يحسن اسمه و يحسن ادبه

''باپ پر بچے کا حق یہ ہے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کو اچھے آداب سکھائے۔'' (کنز العمال، حدیث ۴۵۱۹۲)

واضح سی بات ہے کہ نام کا بچوں کی شخصیت پر گہرا نفسیاتی اثر ہوتا ہے۔عظیم شخصیات اور صاحبان تقویٰ وفضیلت افراد کے ناموں پر بچوں کے نام رکھنا، بچوں کو ذہنی طور پر ان کے قریب کر دیتا ہے۔اسی طرح اہل فسق وفجور کے نام انسان کو ان کے نزدیک کر دیتے ہیں۔

اسلام نے اس لطیف نفسیاتی مسئلہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور کتب احادیث میں اچھے اور برے ناموں کے بارے میں مفصل ابواب مرتب کیے گئے ہیں۔(وسائل الشیعہ، ۱۵: ۱۲۲ تا ۱۳۲)

۷۔ ایک اور حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

ما نحل والد ولده افضل من ادب حسن (کنز العمال، حدیث ۴۵۴۱۱)

''بہترین دولت جو ایک باپ اپنے بچے کو دے سکتا ہے، وہ حسن ادب ہے۔''

۸۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

و انك مسول عما وليته به من حسن الادب و الدلالة على ربه عزوجل و المعونة له على طاعته

''تمہیں جن کا سرپرست بنایا گیا ہے، تم ان کے حسن ادب، اللہ کی طرف ان کی ہدایت اور اللہ کی اطاعت میں ان سے تعاون کرنے کے ذمہ دار ہو۔'' (بحار الانوار، ۷۱: ۴)

۹۔ امیر المومنین علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں کہ حسن اخلاق بہترین ورثہ ہے جو باپ سے اولاد کو ملتا ہے:

خیر ماورث الآباء الابناء الادب

''اچھے آداب وتربیت بہترین ورثہ ہے جو باپ کی طرف سے اولاد کو ملتا ہے۔'' (غرر الحکم)

اس بحث کو نہج البلاغہ میں سے حضرت علی علیہ السلام کے ایک فرمان پر ختم کرتے ہیں۔ جب کچھ جہلاء نے امیر المومنینؑ کی شخصیت کا دوسروں سے موازنہ کیا تو آپؑ نے اپنا مقام اور مرتبہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وقد علمتم موضعی من رسول اللہ بالقرابۃ القریبۃ والمنزلۃ الخصیصۃ وضعنی فی حجرہ و انا ولید یضمنی الی صدرہ..... یرفع لی کل یوم علما من اخلاقہ ویامرنی بالاقتداء

''رسولؐ اللہ سے جو خصوصی قرابت اور منزلت مجھے حاصل تھی، تم اسے خوب جانتے ہو۔ آنحضرتؐ بچپن میں مجھے اپنی گود میں بٹھاتے تھے اور اپنے سینے سے لگاتے تھے اور ہر روز فضائل اخلاق کا ایک پرچم میرے لیے بلند فرماتے تھے اور مجھے حکم دیتے تھے کہ میں ان کی پیروی کروں (میری موجودہ اخلاقی حالت رسولؐ اللہ کی اسی تربیت کا نتیجہ ہے۔''

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس خطبہ میں رسولؐ اللہ کے اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

ولقد قرن اللہ بہ (ص) من لدن ان کان فطیما اعظم ملک من ملائکتہ یسلک بہ طریق المکارم و محاسن اخلاق العالم لیلہ ونہارہ

''رسولؐ اللہ کی شیر خوارگی کے ایام ختم ہوتے ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں میں سے سب سے بڑے فرشتے کو ان کے ساتھ لگا دیا جو انہیں شب و روز اچھی صفات اور اخلاق حسنہ کی راہ پر چلاتا تھا۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ)

بنابرایں رسولؐ اللہ فرشتے کے تربیت یافتہ تھے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ انسان کی اچھی یا بری اخلاقی صفات اس کے اندر سے ہی اور اس کے ارادے سے وجود میں آتی ہیں۔ لیکن اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اچھے اور برے اخلاق کے تشکیل پانے میں متعدد عوامل کارما ہیں جن نیں سے ایک والدین کی طرف سے ملنے والی وراثت اور خاندانی تربیت بھی ہے۔ علمی اور منطقی تجزیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے بہت سے عملی اور تجرباتی دلائل موجود ہیں جن کا انکار ممکن نہیں ہے۔

اسی وجہ سے کسی فرد یا معاشرے کو حسن اخلاق کے زیور سے آراستہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خاندانی وراثت اور تربیت پر توجہ دی جائے اور انسان کی شخصیت کی تشکیل میں اس دور کی اہمیت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

۴۔علم و آگہی کا اثر

اخلاقی تربیت کے لیے ایک اور اہم عنصر افراد کے علم و آگہی کی سطح کو بلند کرنا ہے، اس لیے کہ منطق اور تجربہ کی رو سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ انسان کے علم و معرفت کی سطح جس قدر بلند ہوتی ہے، اس میں اخلاقی فضائل کی نشوونما بھی اسی قدر بہتر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جہالت اور معارف الٰہیہ سے ناواقفیت سے فضائل اخلاقی کو بہت نقصان پہنچتا ہے اور اخلاقی سطح انتہائی پست ہو جاتی ہے۔

کتاب کے آغاز میں ہم علم اور اخلاق کے باہمی تعلق کے بارے میں مختصر بحث کر چکے ہیں۔ ہم نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ ان دونوں کا ایک دوسرے سے اس قدر گہرا تعلق ہے کہ بعض علماء نے کہا ہے کہ علم مساوی ہے اخلاق کے۔

بالفاظِ دیگر علم و حکمت اخلاق کا سرچشمہ ہیں (اور جیسا کہ سقراط سے منقول ہے):

''رذائل اخلاقی جہل و نادانی کا نتیجہ ہیں، مثلاً متکبر اور حاسد انسان اس لیے تکبر اور حسد میں گرفتار ہوتے ہیں کہ وہ ان کے برے اثرات سے لاعلم ہوتے ہیں۔''

بنابرایں اگر معاشرے میں علم و معرفت کی سطح بلند ہو جائے تو اس سے لوگوں کی اخلاقی حالت کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ اگرچہ اس بات میں کسی حد تک مبالغہ پایا جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علم اخلاقی تربیت کی راہ ہموار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اہل علم ہیں، ان کی اخلاقی آلودگی جاہل افراد کی اخلاقی آلودگی کی نسبت کم ہوتی ہے۔ اگرچہ ان دونوں میں استثناء بھی پایا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں رسولؐ اللہ کی دعوت کے بارے میں ہے کہ وہ اس لیے مبعوث ہوئے تا کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات سنائیں اور انہیں اخلاقی آلودگی اور گناہوں سے پاک کریں:

هو الذی بعث فی الامین رسولا منهم یتلوا علیهم ایته ویز کیهم و یعلمهم الکتب والحکمة و ان کانوا من قبل لفی ضلل مبین

''اس طرح، ضلال مبین اور کھلی گمراہی سے نجات اور رذائل اخلاقی اور گناہوں سے پاک ہونا قرآن مجید کی آیات کی تلاوت اور تعلیم کتاب و حکمت کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں جو یقینی طور پر ان دونوں کے باہمی ربط و تعلق کی دلیل ہے۔''

پیام قرآن کے دورۂ اول کی پہلی جلد میں، معرفت و شناخت کی بحث کے ذیل میں ہم نے قرآنی آیات کی رو سے علم و معرفت اور اخلاقی فضائل کے باہمی ربط اور جہل و نادانی اور رذائل اخلاقی کے باہمی ربط پر بہت سارے شواہد پیش کیے۔ یہاں ہم نمونے کے طور پر اختصار کے ساتھ ان نمونوں کا ذکر کریں گے:

۱۔ جہالت ہر فساد اور گمراہی کی جڑ ہے۔ سورۂ نمل کی آیت ۵۵ میں ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام اپنی گمراہ قوم سے کہتے ہیں:

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ۝۵۵

''تم اپنی شہوت کی تسکین کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف رخ کرتے ہو۔تم ایک جاہل قوم ہو۔''

یہاں جہالت اور نادانی کو جنسی انحراف کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ جہالت جنسی بے راہ روی کا سبب ہے۔سورۂ یوسف کی آیت ۳۳ میں ہے کہ حضرت یوسفؑ جنسی بے راہ روی اور جہالت کے باہمی رابطہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ۝۳۳

''(یوسفؑ نے) کہا:اے میرے رب!زندان مجھے اس چیز سے زیادہ پسند ہے جس کی طرف یہ عورتیں مجھے بلاتی ہیں۔اگر تو ان کی چالوں سے مجھے نہ بچائے تو میں ان کی طرف مائل ہوسکتا ہوں اور جاہلوں میں سے ہوجاؤں گا۔''

۳۔ جہالت حسد کی وجوہات میں سے ایک ہے۔سورۂ یوسف کی آیت ۸۹ میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے (جب وہ مصر کے حاکم بن گئے تھے تو غلہ لینے کے لیے آنے والے اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں):

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِیُوْسُفَ وَ اَخِیْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ۝۸۹

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا،جب تم جاہل تھے۔''

یعنی تمہاری جہالت اس حسد کا سبب بنی جس کی وجہ سے تم نے یوسفؑ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور اسے کنویں میں پھینکا۔

۴۔ جہالت تعصب اور ہٹ دھرمی کا سبب ہے۔سورۂ فتح کی آیت ۲۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ اللہ کے خلاف مشرکین کے تعصب اور ان کی ضد کی اصل وجہ ان کی جہالت تھی:

اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِیَّةَ حَمِیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ

''یاد کرو جب کافروں نے اپنے دل جاہلیت کے تعصب سے بھر لیے۔''

۵۔ جہالت اور بہانہ جوئی کا باہمی تعلق ہے تاریخ انبیاء ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ ان کی جاہل قومیں جہالت کی وجہ سے کیسے کیسے بہانے تلاش کرتی رہتی تھیں۔قرآن مجید نے ان کی بہانہ جوئی اور جہالت کے باہمی تعلق کو بار بار بیان فرمایا ہے۔سورۂ بقرہ کی آیت ۱۱۸ میں ہے:

وَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا یُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِیْنَاۤ اٰیَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ

قَبۡلِهِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ؕ تَشَابَهَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ

''جولوگ علم نہیں رکھتے تھے، انہوں نے کہا کہ اللہ ہم سے کیوں بات نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ ان سے پہلے لوگ بھی ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔ ان کے دل ایک جیسے ہیں۔''

یہاں جہل اور لاعلمی کو بہانہ جوئی کا بنیادی سبب قرار دیا گیا ہے اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ اخلاقی بے راہ روی اور جہالت کے درمیان قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔

۶۔ جہالت اور بدگمانی کا بھی تعلق ہوتا ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۴ میں جنگ احد میں شرکت کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ثُمَّ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ الۡغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغۡشٰى طَآٮِٕفَةً مِّنۡكُمۡ‌ ۙ وَطَآٮِٕفَةٌ قَدۡ اَهَمَّتۡهُمۡ اَنۡفُسُهُمۡ يَظُنُّوۡنَ بِاللّٰهِ غَيۡرَ الۡحَـقِّ ظَنَّ الۡجَـاهِلِيَّةِ‌ ؕ

''پھر (شکست کے) غم کے بعد اس نے ہلکی نیند کی شکل میں تم پر امن نازل کیا جس نے تم میں سے کچھ لوگوں کو ڈھانپ لیا جبکہ بعض دوسرے جنہیں اپنی جان کی فکر پڑی ہوئی تھی، اللہ کے بارے میں جاہلیت کی ناحق بدگمانی میں مبتلا تھے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ بدگمانی ایک اخلاقی برائی ہے جو دوسری بہت سی فردی اور معاشرتی برائیوں کا سبب بنتی ہے۔ اس آیت میں جہل اور بدگمانی کا تعلق واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

۷۔ بے ادبی جہالت سے جنم لیتی ہے۔ سورۂ حجرات کی آیت ۴ میں رسولؐ اللہ کے شایانِ شان احترام نہ کرنے والوں کو جاہل قرار دیا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ يُنَادُوۡنَكَ مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ۝

''اے رسولؐ! جو لوگ آپؐ کے حجروں کے باہر سے آپ کو آوازیں دیتے ہیں، ان میں سے اکثر لوگ عقل نہیں رکھتے۔''

اس آیت میں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو وقت بے وقت آنحضرتؐ کے گھر کے باہر آ کر آوازیں لگاتے کہ:

یا محمد ﷺ! یا محمد! اخرج الینا

''اے محمدؐ! باہر آ وَ۔''

ان کی یہ حرکت آنحضرتؐ کو بہت ناگوار اور شاق گزرتی تھی مگر آپؐ شرافت اور لحاظ کی وجہ سے خاموش رہتے تھے۔ یہاں تک کہ سورۂ حجرات کی آیت ۴ نازل ہوئی۔

"اکثرھم لا یعقلون" کے الفاظ اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ کرتے ہیں کہ ان لوگوں کی یہ بے ادبی ان کے عقل و شعور کی سطح نیچی ہونے کی وجہ سے تھی۔

۸۔ اہل جہنم جاہل ہوں گے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اہل جہنم اپنے برے اعمال اور برے اخلاق کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے۔ قرآن شریف جہنم میں جانے والوں کو جاہل اور نادان قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

"ہم نے جنوں اور انسانوں کی اکثریت کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سمجھتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں مگر وہ سنتے نہیں، یہ چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی گمراہ تر ہیں، یہی لوگ غافل ہیں۔" (اعراف:۱۷۹)

اس میں اور قرآن مجید کی کئی دیگر آیات میں جہالت اور بری اخلاقی صفات کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔

۹۔ صبر اور علم کا آپس میں تعلق ہے۔ سورۂ انفال کی آیت ۶۵ میں مسلمانوں کو یہ نکتہ سمجھایا گیا ہے کہ وہ اپنی تعداد کم ہونے کے باوجود ایمان اور صبر کے ذریعے، جو کہ علم و آگہی کا نتیجہ ہے، اپنی اس کمزوری کی تلافی کر سکتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

"اے نبی! مومنین کو جنگ کے لیے جوش دلائیے۔ اگر تم میں بیس صبر کرنے والے ہوں تو دو سو پر غالب آ جائیں گے اور اگر تم میں ایک سو ہوں تو وہ ایک ہزار پر غالب آ جائیں گے، اس لیے کہ وہ (کافر) ناسمجھ لوگ ہیں۔"

جی ہاں! یہ کافروں کی جہالت اور ناسمجھی ہی ہے جس کی وجہ سے وہ سست اور بے صبر ہو جاتے ہیں اور یہ اہل ایمان کے علم و آگہی کا نتیجہ ہے کہ وہ صابر اور ثابت قدم رہتے ہیں، یہاں تک کہ ان کا ایک سپاہی دس کافروں پر بھاری ہوتا ہے۔

۱۰۔ منافقت اور انتشار کا سبب جہالت ہے۔ سورۂ حشر کی آیت ۱۴ میں یہودیوں کے ایک قبیلہ بنونضیر کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے پرفریب ظاہر کے باوجود مسلمانوں کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہے:

لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ؕ

تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۴﴾

''وہ کبھی ایک ہوکر تمہارا مقابلہ نہیں کریں گے بلکہ صرف قلعوں کے اندر بند ہوکر یا دیواروں کے پیچھے سے ہی تم سے جنگ کریں گے۔ان کی آپس کی جنگ بہت شدید ہے،تم انہیں ایک سمجھتے ہومگر انکے دل پراگندہ ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بے عقل ہیں۔''

اس طرح ان کے نفاق اور پراگندگی کو، جو کہ رذائل اخلاقی میں سے ہے، جہالت اور نادانی کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

نتیجہ

جو کچھ مندرجہ بالا دس عناوین کے تحت بیان ہوا ہے، وہ قرآن مجید کی ان آیات کا ایک حصہ ہے جو علم اور فضائل اخلاقی اور دوسری طرف جہل اور رذائل اخلاقی کے باہمی تعلق کو واضح کرتی ہیں۔

یہ بات بکثرت روزمرہ کے مشاہدے میں آتی ہے کہ جاہل اور بے علم افراد برے اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان میں صفات رذیلہ پائی جاتی ہیں۔لیکن جب برے اعمال کی قباحت اور صفات رذیلہ کے نقصانات کے بارے میں ان کے علم و معرفت کی سطح بلند ہوتی ہے اور مبداء و معاد (اللہ اور آخرت) کے بارے میں ان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ ان برے اعمال وصفات کو یا تو مکمل طور پر ترک کر دیتے ہیں یا بہت حد تک کم کر دیتے ہیں۔

اس مسئلہ کی منطقی دلیل بھی واضح ہے۔اعلیٰ صفات اور اعمال صالحہ کی طرف حرکت کرنے کے لیے محرک کی ضرورت ہوئی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اچھے اعمال وصفات کے فوائد اور برے اعمال وصفات کے مفاسد سے آگاہی بہترین محرک ہے۔ اسی طرح مبداء و معاد سے آگاہی اور انبیاء و اولیاء کے مکتب سے آگاہی انسان کو ان کے قریب کرتی ہے جس سے اخلاقی مفاسد کی وسیع سطح پر اصلاح ہوجاتی ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ یہاں علم و آگہی سے مراد مادی فنون اور صنائع سے آگہی نہیں ہے، اس لیے کہ بہت سے لوگ ان چیزوں کا علم رکھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر آلودہ ہوتے ہیں، بلکہ یہاں علم و آگہی سے مراد اعلیٰ انسانی اقدار، تعلیمات الٰہی، معنوی مصالح و مفاسد اور معارف الٰہیہ کا علم ہے۔

علم اور اخلاق کا تعلق احادیث کی روشنی میں

احادیث میں ایسی عبارت بکثرت پائی جاتی ہیں جن سے علم و معرفت و آگاہی اور فضائل اخلاقی کے قریبی تعلق اور جہل و ناآگاہی اور رذائل اخلاقی کے باہمی تعلق کی نشاندہی ہوتی ہے۔ذیل میں ہم نمونے کے طور پر چند احادیث بیان کرتے ہیں:

۱۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ثمرة المعرفة العزوف عن الدنیا

''معرفت کے درخت کا پھل دنیا میں زہد ہے۔'' (غرر الحکم)

یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ زہد اہم ترین اخلاقی فضائل میں سے ہے

۲۔ حضرت علی علیہ السلام سے ہی ایک اور حدیث میں آیا ہے:

یسیر المعرفة یوجب الزهد فی الدنیا

''مختصر سی معرفت بھی اس بات کا سبب ہوجاتی ہے کہ انسان دنیا میں زاہد ہوجائے۔'' (غرر الحکم)

ممکن ہے کہ یہاں معرفت سے مراد اللہ تعالیٰ کی معرفت ہو جس کی ذات پاک کے سامنے ہر چیز چھوٹی اور حقیر ہے۔ یہ معرفت بذات خود دنیا اور دنیوی زرق و برق سے بے نیاز اور بے توجہ ہوجانے کا سبب ہے یا پھر ممکن ہے کہ اس سے مراد دنیا کی بے ثباتی اور گزشتہ اقوام کے انجام کی معرفت ہو جو کہ زہد کی روح انسان کے اندر پیدا کر دیتی ہے، یا پھر ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد آخرت اور وہاں کی عظیم نعمتوں کی معرفت مراد ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے یہ تمام معرفتیں مراد ہوں۔

۳۔ ایک اور حدیث میں جو کہ حضرت علی علیہ السلام سے ہی ہے، بے نیازی اور ترک کے علم و معرفت کے ساتھ تعلق کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے:

من سکن قلبه العلم بالله سبحانه، سکنه الغنی عن الخلق

''جس کے دل میں اللہ کی معرفت جگہ بنالے، وہ لوگوں سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔'' (غرر الحکم)

ظاہر سی بات ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے جمال و جلال کی معرفت رکھتا ہو اور کائنات کو اس کی ذات کا ایک حقیر سا جلوہ سمجھتا ہو، وہ صرف اسی پر توکل کرے گا اور اپنے آپ کو اس کے سوا ہر کسی سے بے نیاز پائے گا۔

۴۔ رسولؐ اللہ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

من عرف الله و عظمه منع فاه من الکلام، و بطنه من الطعام

''جس کو اللہ کی معرفت حاصل ہوجائے اور وہ اس کی عظمت کو جان لے، وہ اپنے منہ کو ناشائستہ باتوں اور اپنے شکم کو حرام خوراک سے محفوظ رکھتا ہے۔'' (اصولِ کافی، ۲: ۲۳۷)

یہ حدیث اللہ کی معرفت اور حفظِ زبان اور حفظ شکم کے باہمی تعلق کو بیان کر رہی ہے۔

۵۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

من عرف الله خاف الله و من خاف الله سخت نفسه عن الدنیا

''جو اللہ کی معرفت حاصل کر لے وہ اللہ سے ڈرتا ہے اور جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ دنیا کی چکاچوند سے بے

نیاز ہوجاتا ہے۔‘‘(اصولِ کافی، ۲:۷ ۲۳)

اس حدیث میں بھی معرفت خدا اور خوف خدا کے بہت سے اخلاقی فضائل کے ساتھ تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔

۶۔ امیر المومنین علیہ السلام ایک حدیث میں عفو و درگزر اور معرفت خدا کے باہمی تعلق کو اس طرح سے بیان فرماتے ہیں:

اعرف الناس باللہ اعذرھم للناس و ان لم یجدلھم عذرا

’’جو شخص سب سے زیادہ اللہ کی معرفت رکھتا ہے، وہ سب سے بڑھ کر لوگوں کو معاف کرتا ہے، خواہ معاف کرنے کی کوئی وجہ بھی موجود نہ ہو۔‘‘(غرر الحکم)

(ظاہری بات ہے کہ یہ حدیث ذاتی امور سے متعلق ہے نہ کہ قومی اور معاشرتی امور سے متعلق)۔

۷۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام ہی سے اللہ کی معرفت اور ترک تکبر کے باہمی ربط کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

و انہ لا ینبغی لمن عرف عظمۃ اللہ ان یتعظم

’’جو اللہ کی عظمت کو جان لے، اسے اظہارِ عظمت زیب نہیں دیتا۔‘‘(نہج البلاغہ، خطبہ: ۱۴۷)

۸۔ پاکیزگی عمل اور علم کے باہمی تعلق کے بارے میں ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

لن یزکی العمل حتی یقارنہ العلم

’’کوئی عمل اس وقت تک پاکیزہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کا علم کے ساتھ تعلق نہ ہو۔‘‘(غرر الحکم)

ظاہری بات ہے کہ عمل کی پاکیزگی عام طور پر اخلاق کی پاکیزگی ہوتی ہے اور یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔

۹۔ اسی سلسلہ میں رسولؐ اللہ سے ایک حدیث میں ہے:

بالعلم یطاع اللہ و یعبد و بالعلم یعرف اللہ و یوحد و بہ توصل الارحام و یعرف الحلال و الحرام، والعلم امام العمل

’’علم و معرفت کے ذریعے ہی اللہ کی اطاعت ممکن ہے، علم کے ذریعے ہی اللہ کی معرفت حاصل کی جا سکتی ہے اور اس کی واحدانیت کو سمجھا جا سکتا ہے، اسی کے ذریعے صلہ رحمی کی جا سکتی ہے، اسی کے ذریعے حلال و حرام کی پہچان ہوسکتی ہے، علم ہی عمل کا رہنما ہے۔‘‘(تحف العقول: ۲۱)

اس حدیث میں بھی بہت سے اخلاقی فضائل کو شجر علم کا ثمر قرار دیا گیا ہے۔

۱۰۔ یہی بات مزید صراحت کے ساتھ امیر المومنین علیہ السلام سے ایک حدیث میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

ثمرۃ العقل مداراۃ الناس

’’عقل کا پھل یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آیا جائے۔‘‘(غرر الحکم)

ان احادیث کے مقابلہ میں ایسی احادیث بھی موجود ہیں جو جہل اور رذائل اخلاقی کے باہمی تعلق کو بیان کرتی ہیں:

۱۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الجهل اصل كل شر

''جہالت ہر برائی کی جڑ ہے۔'' (غرر الحکم)

۲۔ ایک اور حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

الحرص والشره والبخل نتيجة الجهل

''حرص، طمع اور بخل جہالت کا نتیجہ ہیں۔'' (غرر الحکم

اس کی وجہ یہ ہے کہ حریص اور طماع انسان ان چیزوں کی طلب میں تگ و دو کرتا ہے جو اس کی ضروریاتِ زندگی سے زائد ہیں۔ مال و دولت کے ساتھ اس کی محبت ایک غیر منطقی اور غیر معقول لگاؤ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح بخیل اپنے بخل کے ذریعے ان چیزوں کو اپنے پاس رکھتا ہے جنہیں وہ اپنی زندگی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ دوسروں کے لیے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

۳۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام جہل اور رذائل اخلاقی کے باہمی تعلق کو جامع تر انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں:

الجاهل صخرة لا ينفجر ماؤها! وشجرة لا يخضر عودها! وارض لا يظهر عشبها

''جاہل ایک ایسا پتھر ہوتا ہے جس سے پانی نہیں نکلتا، ایک ایسا درخت ہوتا ہے جس کی شاخیں سبز نہیں ہوتیں اور ایک ایسی زمین ہوتا ہے جس میں سے کوئی پودا نہیں اگتا۔'' (غرر الحکم)

۴۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

لا ترى الجاهل لا مفرطا او مفرطا

''جاہل حالت افراط میں ہوتا ہے یا حالت تفریط میں۔'' (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: ۷۰)

اس بات کے مدنظر کہ علمائے اخلاق کے مطابق فضائل اخلاق افراط یعنی زیادہ روی اور تفریط یعنی کوتاہی کے درمیان نقطہ اعتدال پر واقع ہوتے ہیں، اس حدیث سے یہ بات بخوبی عیاں ہو جاتی ہے کہ جہالت اور رذائل اخلاقی کے درمیان قریبی تعلق ہوتا ہے۔

۵۔ علمائے اخلاق کی بڑی تعداد اصلاحِ اخلاق، تہذیب نفس اور خودسازی کے لیے اصلاحِ زبان کو ابتدائی قدم قرار دیتے ہیں۔ احادیث میں جہل و نادانی اور بدزبانی کے درمیان گہرے تعلق کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ ایک حدیث میں حضرت امام محمد تقی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الجاهل اسير لسانه

''جاہل اپنی زبان کا قیدی ہوتا ہے۔''(بحار الانوار، ۷۵:۳۶۸)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ علم اور اخلاق حسنہ اور جہل اور اخلاق رذیلہ کے باہمی تعلق کے بارے میں بکثرت آیات و احادیث پائی جاتی ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تہذیب نفس کا ایک مؤثر ذریعہ علم و آگہی کی سطح کو بلند کرنا ہے۔ مبداء و معاد کی معرفت اور فضائل اخلاقی و رذائل اخلاقی کے اچھے اور برے اثرات سے آگہی، تہذیب اخلاق میں موثر کردار ادا کرتے ہیں۔

علم میں اضافے کی دو شاخیں ہیں:

۱۔ ان میں سے ایک کا تعلق فرد اور معاشرے پر رذائل اخلاقی کے منفی اثرات سے ہے۔ جیسا کہ اگر انسان کو علم ہو کہ شراب اور منشیات انسانی صحت اور معاشرے کو کس قدر ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے ہیں تو ان سے دور رہنے کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ اس طرح سے فضائل اخلاقی کی پرورش اور رذائل اخلاقی کے خاتمہ کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کو فضائل اخلاقی کے فوائد اور رذائل اخلاقی کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے۔ لیکن اس نکتہ کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ علم و آگہی کی سطح میں اضافہ اصلاح اخلاق کی علت تامہ نہیں ہے مگر اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ حصولِ فضائل اخلاقی کا راستہ ضرور ہموار کرتی ہیں۔

۲۔ علم و آگہی میں اضافے کی دوسری شاخ کا تعلق اس بات سے ہے کہ مجموعی طور پر معاشرے کی علمی سطح کو بلند کیا جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب مبداء و معاد، انبیاء و اولیاء کے حالات اور اس قسم کی دیگر چیزوں کے بارے میں انسان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے تو انسان کے اندر فضائل اخلاقی کی محبت اور رذائل اخلاقی سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

بالفاظ دیگر معرفت و آگہی کی سطح کم ہونے سے اور معارف و عقائد سے جہالت کی وجہ سے انسان کے اندر صفات رذیلہ کا خارزار پیدا کرنے کے لیے مناسب حالات فراہم ہو جاتے ہیں جبکہ علم و معرفت میں اضافے سے فضائل اخلاقی کا گلستان پیدا ہونے کے حالات فراہم ہو جاتے ہیں۔

۵۔ معاشرتی ثقافت کا اخلاقی تربیت پر اثر

ثقافت ان امور کے مجموعہ کو کہتے ہیں جو انسان کی روح اور فکر کی تشکیل کرتے ہیں اور مختلف مسائل میں اس کے رجحانات کو معین کرتے ہیں۔

کسی معاشرے کے عقائد، تاریخ، آداب و رسوم، فن و ادب کے مجموعہ کو اس معاشرے کی ثقافت کہا جاتا ہے۔ تربیت اخلاق کے سلسلہ میں ان میں سے بعض مثلاً ''معاشرتی ماحول'' پر ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ اب ہم کسی معاشرے میں فضائل اخلاقی کی بنیادوں کے استحکام یا رذائل اخلاقی کو گہرا کرنے میں ثقافت کے دیگر عناصر کے کردار کا جائزہ لیں گے۔

ان عناصر میں سے ایک تو کسی معاشرے کی تاریخ اور آداب و رسوم ہیں۔ اگر ان کا محور اخلاقی فضائل ہوں تو معاشرے میں

اعلیٰ انسانی صفات کی پرورش اور تہذیب نفس کے لیے مناسب حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کی بنیاد رذائل اخلاقی ہوں تو معاشرہ برائیوں کی لپیٹ میں آنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔

قرآن مجید کی آیات میں اس بارے میں واضح اشارات ملتے ہیں جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی اقوام صرف اس لیے رذائل اخلاقی کے ہولناک گڑھے میں گر گئیں کہ ان کے معاشرے پر غلط آداب ررسوم اور جاہلانہ ثقافت کی حاکمیت قائم تھی، مثلاً:

۱۔ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴿۲۸﴾

''جب یہ کوئی برا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو ایسا کرتے ہوئے پایا ہے اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ اللہ برے کاموں کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی بات کہتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے؟'' (اعراف:۲۸)

۲۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴿۱۷۰﴾

''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے، اس کی پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ایسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا تھا۔ اگر ان کے آباء واجداد عقل نہ رکھتے ہوں اور ہدایت پر نہ ہوں تو کیا پھر بھی یہ ان کی پیروی کریں گے؟'' (بقرہ:۱۷۰)

۳۔ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ﴿۵۲﴾ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ﴿۵۳﴾

''جب انہوں نے اپنے باپ (آذر) اور اپنی قوم سے کہا یہ کیسی مورتیاں ہیں جن کی تم پرستش کرتے ہو تو انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو ان کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔'' (انبیاء: ۵۲، ۵۳)

۴۔ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ﴿۲۳﴾

''آپ سے پہلے ہم نے جس بستی میں کوئی خبردار کرنے والا بھیجا تو اس بستی کے مغرور دولت مندوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو ایک طریقے پر دیکھا ہے اور ہم انہی کی راہ پر چلیں گے۔''

(زخرف:۲۳)

۵۔ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ۝۸۲

''لیکن اس کی قوم کے پاس صرف یہی جواب تھا کہ انہیں اپنی بستی سے باہر نکال دو کیونکہ یہ طہارت پسند ہیں۔''(اعراف:۸۲)

۶۔ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ۝۵۸ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۝۵۹

''جب ان میں سے کسی کو یہ خبر دی جاتی ہے کہ اس کے ہاں بیٹی ہوئی ہے تو شدت غم سے اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور سخت غصے میں آ جاتا ہے اور اس بری خبر کے سننے کے بعد اپنی قوم سے منہ چھپاتا پھرتا ہے اور یہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ آیا ذلت کے ساتھ اس بچی کو رکھ لے یا اسے مٹی میں دفن کر دے۔ یہ کتنا برا فیصلہ کرتے ہیں۔''(نحل:۵۸،۵۹)

۷۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ

''محمد اللہ کے رسولؐ ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے خلاف سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔تم انہیں حالت رکوع وسجود میں پاؤ گے۔ وہ اپنے رب سے اس کے فضل اور خوشنودی کے طالب ہیں۔ان کے چہروں پر سجدوں کے آثار ان کی پہچان ہے۔''(فتح:۲۹)

تفسیر اور نتیجہ

ہماری گفتگو اس بارے میں ہے کہ ہر قوم کی ثقافت اخلاقی صفات کو پروان چڑھانے میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔اعلیٰ اور عمدہ ثقافت میں اعلیٰ اخلاقی صفات کے حامل افراد کی تربیت ہوتی ہے۔ بری اور روبہ انحطاط ثقافت رذائل اخلاقی کو پروان چڑھانے کا کام کرتی ہے۔مندرجہ بالا آیات ان دونوں نکات کی طرف واضح اشارہ کر رہی ہیں۔

پہلی آیت میں ان شیطان صفت گمراہ لوگوں کا ذکر ہے جو اپنے برے کاموں کا جواز اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہم نے یہ طریقہ اپنے بزرگوں سے سیکھا ہے:

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا

بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے اور ہم یہ کام اللہ کے حکم سے کر رہے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے بزرگوں کے طور طریقوں کو اپنے عمل کے اچھا ہونے کی دلیل قرار دیتے تھے اور نہ صرف یہ کہ ان پر کوئی شرم محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ ان پر فخر بھی کرتے تھے۔

دوسری آیت میں بھی یہی بات ایک اور انداز میں کہی گئی ہے کہ جب ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ آؤ، جو کچھ اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل کیا ہے، اس کی پیروی کرو تو وہ غرور و تکبر سے کہتے تھے کہ ہم ہرگز ایسا نہیں کریں گے۔ ہم تو وہی کریں گے جو کچھ ہم نے اپنے آباء واجداد کو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے جاہلانہ طور طریقے اور اخلاقی رذائل ان کی نظر میں اللہ کی آیات سے زیادہ قابل قدر تھے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ

قرآن شریف مزید کہتا ہے کہ کیا ان کے آباء واجداد گمراہ نہ تھے؟ (پھر کیوں وہ ان جاہلوں کی روش کو قرآن کی حیات بخش تعلیمات پر مقدم قرار دیتے ہیں.....؟):

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

تیسری آیت میں بھی ہم خلاف اخلاق اعمال پر غلط ثقافت کے اثرات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس آیت میں ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنی قوم کے ساتھ گفتگو کو دیکھتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تم کیوں ان بے جان مورتیوں کی عبادت کرتے ہو؟ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ لہٰذا ہم بھی ایسا ہی کریں گے:

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی اس اندھی تقلید پر زبردست تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''یقیناً تم اور تمہارے باپ دادا کھلی گمراہی میں ہو۔''

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾

لیکن بدقسمتی سے یہ کھلی گمراہی نسل در نسل منتقل ہوتی گئی اور ایک ثقافت کی صورت اختیار کر گئی۔ نہ صرف یہ کہ لوگ اسے برا نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس پر فخر بھی کرتے تھے۔

چوتھی آیت میں بھی یہی بات ایک اور شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ جب بت پرستوں سے سوال کیا جاتا ہے کہ تم

باشعور انسان ہوتے ہوئے بے شعور بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو؟ تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو ایک مذہب پر دیکھا ہے اور ان کی تقلید کرتے ہوئے ہم ہدایت پر ہیں:

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ﴿۲۲﴾

وہ اپنے اس احمقانہ کام کو نہ صرف یہ کہ گمراہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے آباء واجداد سے ملنے والی ہدایت سمجھتے تھے۔ اگلی آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ طرزِ تفکر سب مترفین (مغرور دولت مندوں) میں پایا جاتا ہے:

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ﴿۲۳﴾

ظاہر سی بات ہے کہ یہ اندھی تقلید جس کی وجہ سے برائی، اچھائی نظر آتی تھی، بہت سی وجوہات رکھتی تھی لیکن اس کی ایک وجہ یقیناً یہ تھی کہ برائی ایک دیر پا ثقافت کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

سورۂ مائدہ کی آیات ۱۰۳ اور ۱۰۴ میں یہ بات اس طرح بیان ہوئی ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں نے حلال وحرام کے سلسلہ میں کچھ احمقانہ بدعتیں اپنا رکھی تھیں جس کی وجہ سے انہوں نے حلال خوراک کو اپنے اوپر حرام کر رکھا تھا۔ وہ اپنی اس روش پر اس قدر سختی سے کاربند تھے کہ اس کے مقابلہ میں آیاتِ الٰہی کو کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہ تھے اور ان کے جواب میں یہ کہتے تھے کہ:

حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ

''جو کچھ ہمیں اپنے آباء واجداد سے ملا ہے، وہی ہمارے لیے کافی ہے۔''

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آداب ورسوم بدکس حد تک غیر اخلاقی صفات کی راہ ہموار کر دیتے ہیں۔ رذائل کو فضائل میں بدل دیتے ہیں اور گمراہانہ عقائد کو عین ہدایت سمجھتے ہیں۔

پانچویں آیت میں اخلاقی اقدار پر معاشرتی آداب وسنن کی تاثیر کے بارے میں ایک نئی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ قوم لوط جن کے اخلاقی انحراف نے تاریخ کے صفحات کو سیاہ کر دیا ہے (اور بدقسمتی سے یہ برائی ہمارے جدید دور جاہلیت میں مغربی تمدن کے مراکز میں ماضی کی نسبت زیادہ کریہہ اور قانونی شکل میں رونما ہو چکی ہے) جب حضرت لوط اور ان کے ساتھیوں نے انہیں تقویٰ اور پاکیزگی اختیار کرنے کی دعوت دی تو وہ بہت برہم ہوئے اور چلانے لگے کہ ان لوگوں کو اپنے شہر میں سے باہر نکال دو جو یہ چاہتے ہیں کہ پاکیزگی یا تقویٰ کو رواج دیں (یا پاکیزگی وتقویٰ کا مظاہرہ کرتے ہیں):

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ﴿۸۲﴾

آلودہ ماحول اور غلط ثقافت نے ان پر اتنا گہرا اثر ڈالا تھا کہ وہ تقویٰ اور پاکیزگی کو گناہ سمجھنے لگے تھے اور ناپاکی اور آلودگی

پرفخر کرتے تھے۔ظاہری بات ہے کہ ایسے معاشرے میں رذائل اخلاقی تیزی سے پھیلتے ہیں اور فضائل اخلاقی کمزور ہوجاتے ہیں۔

چھٹی آیت میں زمانۂ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کی وحشت ناک رسم کی نشاندہی کی گئی ہے جو ایک غلط رسم سے مانوس ہوجانے کی وجہ سے وجود میں آئی تھی۔

زمانۂ جاہلیت کے عرب بیٹی کی پیدائش کو اپنے لیے ذلت کا سبب سمجھتے تھے۔جب بھی ان میں سے کسی کو بیٹی کی پیدائش کی خبر دی جاتی تو غم و غصے کی شدت سے اس کا چہرہ سیاہ ہوجاتا تھا اور کئی کئی دن ہفتے وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا تھا کہ اس ذلت کو قبول کرکے بیٹی کو اپنے پاس زندہ رہنے دے یا اسے دفن کرکے اس ذلت سے نجات حاصل کرلے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْۗءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝

ظاہری بات ہے کہ نومولود بچے کا قتل قبیح ترین اور انتہائی قابل نفرت کام ہے لیکن غلط آداب ورسوم کی وجہ سے اس کے برا ہونے کا احساس ختم ہوچکا تھا اور لوگ اسے ایک فضیلت اور افتخار سمجھنے لگے تھے۔

بعض تفاسیر میں اس وحشت ناک مسئلہ کے بارے میں لکھا ہے کہ زندہ دفن کرنا لڑکیوں کو ہلاک کرنے کا ایک طریقہ تھا جبکہ اس کے کئی اور طریقے بھی رائج تھے۔بعض اوقات وہ لڑکی کو ہلاک کرنے کے لیے اسے پانی میں ڈبودیتے تھے۔کبھی پہاڑ کے اوپر سے نیچے پھینک دیتے تھے اور بعض اوقات انہیں ذبح کردیتے تھے۔اس بری رسم کے آغاز اور اس کے اسباب کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔جو حضرات اس کا مطالعہ کرنا چاہیں، وہ تفسیر نمونہ، سورۂ نحل کی آیت ۵۸ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

جو بات ہم ثابت کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ایسی رسوم بدترین رذائل اخلاقی کے لیے زمین ہموار کردیتی ہیں اور بدترین رذائل کو بہترین فضائل میں بدل دیتی ہیں۔یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ کسی قوم کی ثقافت، فضائل یا رذائل کی طرف مائل کرنے کا ایک اہم محرک ہوتی ہے۔جو لوگ رذائل اخلاقی کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، ان کو چاہئے کہ وہ ثقافت کی تبدیلی کے لیے جدوجہد کریں۔

اس کی مثالیں ہم اپنے موجودہ دور میں بھی دیکھ سکتے ہیں کہ عرب کے دور جاہلیت کی طرح آج بھی جاہلیت کی ثقافت مختلف قسم کے اخلاقی رذائل کا اصل سبب بنی ہے۔مثال کے طور پر چند سال قبل چین میں عورتوں کے حقوق کے بارے میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی۔اس کانفرنس میں شریک ممالک کی اکثریت کا اصرار تھا کہ ان تین باتوں کی حمایت کی جائے:

۱۔ عورتوں کے جنسی تعلقات کی آزادی۔

۲۔ ان میں ہم جنسیت کو جائز قرار دیا جائے۔

۳۔ اسقاطِ حمل کی آزادی۔

بعض اسلامی ممالک نے، جن میں ہمارا ملک بھی شامل ہے، اس کی شدت سے مخالفت کی۔

ظاہری بات ہے کہ جب اقوام کے تعلیم یافتہ نمائندے ان برے اور گھناؤنے کاموں کو عورتوں کے حقوق کی آڑ میں جائز

قرار دینے لگیں اور اس کی بنیاد پر جب ثقافت تشکیل پا جائے تو لوگوں کے درمیان کیسے کیسے اخلاقی رذائل کی ترویج ہوگی۔ ان اخلاقی رذائل کا نہ صرف تہذیب اخلاق بلکہ معاشرتی اور اقتصادی زندگی پر بھی نمایاں اثر پڑتا ہے۔

اس سلسلہ کی ساتویں اور آخری آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ آنحضرتؐ نے اس تاریک معاشرے میں جس ثقافت کی بنیاد رکھی، اس میں انہوں نے کس قدر سرعت کے ساتھ فضائل اخلاقی کے مراحل طے کیے۔ آیت کہتی ہے:

''محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں (ان میں یہ نمایاں صفات پائی جاتی ہیں کہ) وہ کفار کے ساتھ سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ تم انہیں ہمیشہ حالت رکوع و سجود (یعنی عبادت میں مشغول) پاؤ گے، وہ اپنے رب کے فضل اور خوشنودی کے خواہش مند ہیں اور ان کی نشانی یہ ہے کہ سجدے کا نشان ان کے چہرے پر نمایاں ہے۔''

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ

ظاہری بات ہے کہ "والذین معه" (جو لوگ ان کے ساتھ ہیں) سے مراد صرف وہ لوگ نہیں ہیں جو کسی زمان و مکان میں ان کے ساتھ رہے ہوں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے عقائد کو تسلیم کرنے میں اور الٰہی آداب و سنن پر مبنی ثقافت کو قبول کرنے میں رسولؐ اللہ کا ساتھ دیا۔

معاشرتی آداب و رسوم اور اخلاق کا باہمی تعلق احادیث کی روشنی میں

اسلام نے اچھے آداب و رسوم کی پیدائش اور برے آداب و رسوم کے ساتھ مقابلہ کرنے کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ احادیث میں بھی اس مسئلہ پر بہت تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں اچھے آداب و رسوم کی داغ بیل ڈال کر اخلاقی اعمال کی انجام دہی کی راہ ہموار کی جا سکے اور رذائل اخلاقی کی روک تھام کی جا سکے۔

مندرجہ ذیل احادیث میں سے ہر ایک اس سلسلہ میں ایک خاص نکتہ کو بیان کر رہی ہے:

ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

"خمس لا ادعهن حتی المهات الاکل علی الحضیض مع العبید..... وحلب العنز بیدی ولبس الصوف و التسلیم علی الصبیان، لتکون سنة من بعدی

(بحار الانوار، ۷۳:۶۶)

''میں پانچ کاموں کو زندگی بھر ترک نہیں کروں گا: غلاموں کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانا، اپنے ہاتھ سے بکری کا دودھ دوہنا، کھردرا لباس پہننا اور بچوں کو سلام کرنا تا کہ یہ میرے بعد سنت بن جائے۔''

ان کاموں کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے اندر تواضع وفروتنی کو پیدا کیا جائے۔

ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ سے مروی ہے:

من سن سنة حسنة عمل بها من بعده كان له اجره و مثل اجورهم من غير ان ينقص من اجورهم شيئا، ومن سن سنة سيئة فعمل بها بعده كان عليه وزره و مثل اوزارهم من غير ان ينقص من اوزارهم شيئا

''جو کوئی کسی اچھے عمل کی بنیاد ڈال دے اور لوگ اس پر عمل کرتے رہیں تو اسے اپنے نیک کام کا اجر بھی ملے گا اور ان سب لوگوں کے اجر کے برابر بھی اجر ملے گا جو اس کام کو انجام دیں گے اور ان کے اجر میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ جو کوئی کسی برے کام کی بنیاد ڈالے اور بعد میں لوگ اس پر عمل کریں تو اسے اپنے برے کام کے گناہ کی وجہ سے ان سب کے برے کام کا گناہ بھی ہوگا اور ان کے گناہ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔''(کنزالعمال:۱۵:۰۷۸)

اسی مضمون سے ملتی جلتی حدیث علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار میں نقل کی ہے۔

یہ حدیث جو مختلف الفاظ میں رسولؐ اکرم، امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہا السلام سے نقل ہوئی ہے، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اخلاقی اعمال کا راستہ ہموار کرنا اس قدر اہم ہے کہ اس کام کو انجام دینے والا اس کے تمام آثار ونتائج میں شریک ہوتا ہے۔ اسی طرح سے گمراہی و بدکاری کی راہ ہموار کرکے رذائل اخلاقی کی بنیاد ہموار کرنے والا بھی اس کے تمام آثار ونتائج میں شریک ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام نے مالک اشتر کو تاکید کے ساتھ نصیحت کی کہ ''اچھے آداب ورسوم کی حفاظت کرنا اور ان کو ختم کرنے سے پرہیز کرنا۔''

لا تنقض سنة صالحة عمل بها صدور هذه الامة و اجتمعت بها الالفة وصلحت عليها الرعية، ولا تحدثن سنة تضر بشيء من ماضي تلك السنن فيكون الاجر لمن سنها و الوزر عليك بما نقضت منها

''کسی ایسی اچھی سنت کو جسے اس امت کے گزشتگان نے قائم کیا اور لوگ اس سے مانوس ہو چکے ہوں

اوراس سے امت کے امور کی اصلاح ہوتی ہو، نہ توڑنا اور کسی ایسی سنت کو ایجاد نہ کرنا جو گزشتگان کی اچھی سنتوں کو نقصان پہنچائے، اس لیے کہ جنہوں نے ان سنتوں کو قائم کیا، ان کا اجر انہیں ملے گا اور ان کو ختم کرنے کا گناہ تم پر ہوگا۔'' (نہج البلاغہ، مکتوب: ۵۳)

درحقیقت اچھے طور طریقوں کو ایجاد کرنے سے کار ہائے خیر اور پرورش فضائل اخلاقی میں مدد ملتی ہے اور یہ درحقیقت نیکی اور خیر میں تعاون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح برے طور طریقے ایجاد کرنا گناہ اور بدکاری میں تعاون کرنے کے مترادف ہے۔ ان اچھے یا برے اعمال میں ان کے قائم کرنے والے بھی شریک ہوتے ہیں جبکہ ان اعمال کے انجام دینے والوں کے اجر وثواب یا عذاب وگناہ میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

سنت حسنہ کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ رسولؐ اللہ سے مروی ایک مشہور حدیث میں ہے کہ حضرت عبدالمطلب نے اسلام سے قبل پانچ سنتیں قائم کی تھیں اور اللہ تعالیٰ نے ان سب کی تائید کرتے ہوئے انہیں احکام اسلام میں شامل کر دیا۔ وہ پانچ سنتیں یہ ہیں کہ:

''انہوں نے باپ کی بیوی کو بیٹے پر حرام قرار دیا،
قتل کا خون بہا ایک سو اونٹ مقرر کیا،
بیت اللہ کے گرد سات چکروں کا طواف مقرر کیا،
انہیں ایک خزانہ ملا تو انہوں نے اس کا خمس ادا کیا اور زمزم کو نئے سرے سے کھود کر اسے سقایۃ الحجاج کا نام دیا۔''

كانت لعبد المطلب خمسا من السنن اجريها الله عزوجل فى الاسلام حرم نساء الاباء على الابناء، و سن الدية فى القتل ماة من الابل و كان يطوف بالبيت سبعة اشواط، ووجد كنزا فاخرج منه الخمس، وسمى زمزم حين حفرها سقاية الحاج

مندرجہ بالا احادیث اور دیگر بہت سی احادیث سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ کسی قوم کے آداب و رسوم اور ثقافت اس قوم کے اعمال اور اخلاق پر فیصلہ کن اثر ڈالتے ہیں۔ اسلام اس مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہوئے اچھے آداب و رسوم کی حفاظت کو ضروری قرار دیتا ہے اور برے آداب ورسوم کو قائم کرنے یا ان کی حفاظت کرنے کو گناہ کبیرہ قرار دیتا ہے۔

۶۔ عمل اور اخلاق کا تعلق

یہ بات بالکل بجا ہے کہ انسان کے اعمال اس کے اخلاق سے جنم لیتے ہیں اور انسان کے باطنی اخلاق کا اظہار اس کے اعمال سے ہوتا ہے لیکن دوسری طرف یہ بات بھی صحیح ہے کہ انسان کے اعمال بھی اس کے اخلاق کی تشکیل میں کردار ادا کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر ایک اچھے یا برے عمل کو مسلسل انجام دیا جائے تو وہ انسان کی پختہ عادت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ تہذیب اخلاق کا ایک راستہ تہذیب اعمال ہے۔ انسان کو اس بات پر خاص توجہ دینی چاہیے کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی برا عمل بار بار تکرار کے نتیجہ میں اس کی روح کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں قائم کر لے اور انسان کی روح کو اپنے رنگ میں رنگ لے۔

اسی لیے آیات و احادیث میں حکم دیا گیا ہے کہ گناہ اور برائی کے سرزد ہونے کے بعد فوراً توبہ کی جائے۔ یعنی توبہ کے پانی سے دل کو گناہ کے اثرات سے پاک کر لیا جائے تا کہ تکرارِ عمل کے ذریعے برا عمل اخلاق رذیلہ میں تبدیل نہ ہو جائے۔

اس کے برعکس اسلام میں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ انسان اچھے اعمال کو اس قدر تکرار کے ساتھ انجام دے کہ وہ ایک پختہ عادت بن جائے۔

اس اشارہ کے بعد ہم چند آیات نقل کرتے ہیں جن میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

۱۔ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾

''جو وہ سمجھ رہے ہیں ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ ان کے اعمال ہیں جو زنگ کی طرح ان کے دلوں کو لگ گئے ہیں۔'' (مطففین: ۱۴)

۲۔ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ

''اسی طرح اسراف کرنے والوں کے اعمال ان کے لیے خوش نما بنا دیئے گئے۔'' (یونس: ۱۲)

۳۔ اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ

''کیا وہ جس کے برے اعمال اس کے لیے خوش نما بنا دیئے گئے ہوں اور وہ انہیں اچھا سمجھتا ہو، اس شخص کی مانند ہو سکتا ہے جو حقیقت کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے وہ ہے۔'' (فاطر: ۸)

۴۔ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ

''میں نے اسے اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال ان کے لیے خوش نما بنا دیئے ہیں۔'' (نمل: ۲۴)

۵۔ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾

''اے رسولؐ! ان سے کہو کہ کیا میں تمہیں ان لوگوں کے بارے میں خبر دوں جو سب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری کوشش دنیوی زندگی میں کھو کر رہ گئی اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے عمل کر رہے ہیں۔'' (کہف: ۱۰۳، ۱۰۴)

۶۔ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾

''توبہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو از روئے جہالت برا کام کر گزرتے ہیں اور پھر جلدی سے توبہ کر لیتے ہیں، اللہ ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور اللہ علیم وحکیم ہے۔'' (نساء: ۱۷)

۷۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ۔ ۱۰۳)

''اے رسولؐ! ان کے اموال سے صدقہ (زکوٰۃ) لو تاکہ اس طرح تم ان کو پاک کرو اور ان کا تزکیہ کرو۔''

تفسیر اور ترجمہ

پہلی آیت میں گناہ اور برے اعمال کے ان آثار کا ذکر کیا گیا ہے جو انسان کے قلب اور روح پر مرتب ہوتے ہیں جن سے دل کی پاکیزگی اور نورانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ان کی جگہ تاریکی اور ظلمت لے لیتی ہے۔ آیت کہہ رہی ہے:

''یہ کم بچنے والے جو سوچ رہے ہیں، حقیقت میں اس طرح نہیں ہے بلکہ ان کے اعمال زنگ کی طرح ان کے دلوں پر لگ گئے ہیں۔''

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾

آیت کا یہ حصہ ''مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ'' فعل مضارع ہے جو استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ برے اعمال کو مسلسل انجام دینے سے ان کے روح اور دل پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جس طرح زنگ آئینے کی چمک کا خاتمہ کر کے اسے تاریک کر دیتا ہے، اسی طرح گناہ کے بارے میں بے توجہی، انسان کے دل پر ظلمت اور شقاوت کا زنگ چڑھا دیتی ہے۔

''ران'' اس زنگ کو کہتے ہیں جو قیمتی چیزوں کی چمک کو ختم کر دیتا ہے۔ زنگ درحقیقت اس سرخ رنگ کی تہہ کو کہتے ہیں جو ہوا میں موجود نمی کی وجہ سے لوہے کو لگ جاتا ہے جس سے عام طور پر لوہا اور دھاتیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔

انسان کے دل پر گناہوں کے تباہ کن اثرات کو بیان کرنے کے لیے یہ بہت مناسب الفاظ ہیں جو آیات واحادیث میں بار

بار استعمال ہوئے ہیں۔ احادیث کی بحث میں ہم ان الفاظ پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

دوسری آیت میں دل پر زنگ لگ جانے کے مرحلہ سے بھی اگلے مرحلہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مرحلہ تزئین اعمال کا مرحلہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ برے اعمال اگر تکرار کے ساتھ انجام دیئے جائیں تو آہستہ آہستہ انسان ان سے مانوس ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ برے اعمال اس کو خوش نما اور دلکش معلوم ہونے لگتے ہیں اور وہ ان پر فخر کرنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے:

''اس طرح مسرفین کے اعمال ان کی نظروں میں خوش نما بنا دیئے جاتے ہیں۔''

كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ

''ما كانوا يعملون'' اور ''مسرفين'' کے الفاظ گناہ کے تکرار اور اس کے بار بار انجام دینے پر دلالت کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ برے اعمال کو مسلسل انجام دینے سے نہ صرف وہ انسان کی نظر میں برے نہیں رہتے بلکہ بتدریج وہ اچھے اعمال نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ بذات خود ایک صفت رذیلہ ہے جو تکرار گناہ کے نتیجہ میں گناہگار انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ کون ان برے اعمال کو ایسے افراد کے لیے خوش نما بناتا ہے!

بعض آیات میں اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دی گئی ہے۔ درحقیقت یہ ان لوگوں کے گناہوں کی ایک سزا ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں ملتی ہے، اس لیے کہ جب وہ برے اعمال کو خوبصورت سمجھتے ہیں تو ان کو اور بھی زیادہ ذوق وشوق سے انجام دیتے ہیں اور دنیا اور آخرت میں اپنی رسوائی اور بدبختی کا سامان کرنے لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ

''جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم ان کے اعمال ان کے لیے خوش نما بنا دیتے ہیں۔'' (نمل: ۴)

لیکن سورۂ انعام کی آیت ۴۳ میں اس کی نسبت شیطان کی طرف دی گئی ہے جس میں کفر و گمراہی پر اصرار کرنے والے کفار کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

''لیکن ان کے دل سخت ہو گئے اور جو کام وہ کرتے تھے شیطان نے انہیں ان کے لیے خوش نما بنا دیئے۔''

بعض اوقات اس کی نسبت بتوں کی طرف دی گئی ہے:

وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ

''اسی طرح اکثر مشرکین کے شرکاء (بتوں) نے ان کی اولاد کے قتل کو ان کے لیے خوش نما بنا دیا۔''

بعض اوقات اس حقیقت کا ذکر فعل مجہول کی صورت میں کیا گیا ہے جیسا کہ ہمارے زیر بحث آیت میں یہی اسلوب اختیار

کیا گیا ہے۔

اگر ذرا غور وفکر سے کام لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عبارات کے اس اختلاف کے باوجود معنی میں کوئی تضاد یا فرق نہیں پایا جاتا بلکہ یہ ایک دوسرے کی تکمیل کر رہی ہیں۔ بعض اوقات تکرار عمل باعث زینت ہوتا ہے، اس لیے کہ عمل کے تکرار سے اس کے قبیح ہونے کا احساس ختم ہو جاتا ہے اور حالت یہ ہوتی ہے کہ انسان اس کے بارے میں غیر جانبدار ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی اس عمل کو انجام دیا جائے تو آہستہ آہستہ وہ اچھا اور خوش نما نظر آنے لگتا ہے اور ایک زنجیر کی طرح اس عمل کے انجام دینے والے کے ہاتھ پاؤں میں پڑ جاتا ہے جس سے نکلنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ یہ ایسی حقیقت ہے جو جرائم پیشہ افراد کے حالات کا مطالعہ کرنے والا ہر انسان بآسانی دیکھ سکتا ہے۔

بعض اوقات اندر سے نفس امارہ کے وسوسے اور باہر سے شیطان کے وسوسے انسان کے برے اعمال کو اس کے لیے خوش نما بنا کر دکھاتے ہیں، خواہ اس نے اس عمل کو مکرر انجام نہ دیا ہو، ایسی صورت میں بعض اوقات نوبت یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ انسان کسی گناہ کبیرہ کو اپنا انسانی یا دینی فرض سمجھ کر انجام دے رہا ہوتا ہے۔ ایسا شخص کسی کی غیبت کو واجب قرار دے کر اس کی غیبت کرنے لگتا ہے، حالانکہ اس بیچارے کا کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ یہ غیبت کرنے والے شخص کا حسد ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس کی غیبت کر رہا ہوتا ہے۔ تاریخ ایسے لوگوں کے واقعات سے بھری پڑی ہے جنہوں نے ہولناک جرائم کا ارتکاب کیا۔ چونکہ ان کے یہ جرائم ہوائے نفس اور شیطانی وسوسوں کے مطابق تھے، لہٰذا وہ نہ صرف یہ کہ ان اعمال کو برا نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان پر فخر بھی کرتے تھے۔

بعض اوقات اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کی سزا دینا چاہتا ہے۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کی بدکاریوں کو ان کی نظر میں خوش نما بنا دیتا ہے تاکہ وہ اور زیادہ رسوا ہوں اور ان کو زیادہ سنگین سزا ملے۔

یہ نکتہ بھی ضرور مدنظر رہے کہ توحید افعالی کی رو سے اس کائنات میں ہونے والے کام کو اللہ کی طرف نسبت دی جا سکتی ہے، اس لیے کہ اس کی ذات پاک علت العلل ہے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ لوگ اپنے اعمال کے جوابدہ نہ ہوں۔ تمام حمد وثناء اس خدائے بزرگ وبرتر کے لیے ہے جس نے طاقت اور قدرت عطا کی اور لعنت ہو ان لوگوں پر جو اس طاقت اور قدرت کو گناہ میں صرف کرتے ہیں۔

بعض اوقات فطرت اور طبیعت کا تقاضا ہوتا ہے کہ یہ چیزیں انسان کو خوش نما دکھائی دیں۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۴ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ

یعنی ''مادی چیزوں مثلاً بیوی، بچے اور سونا چاندی وغیرہ لوگوں کی نظر میں خوش نما بنا دیئے جاتے ہیں (تاکہ اس طرح ان کی آزمائش ہو سکے)۔''

برے کاموں کے خوبصورت نظر آنے کی ایک وجہ ان کاموں کا تکرار ہے جس سے وہ عمل انسان کی روح اور دل پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی اخلاقی کیفیت کو بدل دیتا ہے جبکہ اچھے اعمال کی تکرار سے انسان کے اندر اخلاق فاضلہ کا ملکہ پیدا ہوجاتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جو لوگ تہذیب نفس اور فضائل اخلاقی کے حصول کی راہ پر چلنے کے خواہش مند ہیں، وہ اچھے اعمال کے تکرار سے مدد حاصل کریں اور برے کاموں کے تکرار سے بچیں کیونکہ اچھے کاموں کا تکرار انسان کا معین و مددگار ہوتا ہے جبکہ برے اعمال کا تکرار دشمن اور غدار ہوتا ہے۔

تیسری آیت میں پھر برے اعمال کی تزئین کا ذکر ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''کیا وہ شخص جس کے برے اعمال اس کے لیے خوش نما بنا دیئے گئے ہیں اور وہ انہیں اچھے اعمال کی صورت میں دیکھ رہا ہے (وہ اس شخص کی مانند ہوسکتا ہے جو حقیقت بین ہے اور حقیقت کو اس کی اصل صورت میں دیکھتا ہے؟'')

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ

اس آیت میں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اس شخص کا ذکر کرتا ہے جس کی نظر میں اس کے برے اعمال خوش نما بنا کر دکھائے جاتے ہیں تو اس کے مقابل کا صاف الفاظ میں ذکر نہیں کیا گیا۔ گویا آیت سامعین کو ایک وسیع منظر پیش کر رہی ہے کہ ایسے شخص کے برعکس جو کچھ انہیں نظر آ سکتا ہے، اسے دیکھیں اور اس کا تصور کریں۔ آیت درحقیقت یہ بیان کرنا چاہتی ہے کہ آیا ایسا شخص اس حقیقت پسند اور حقیقت بین شخص کی مانند ہوسکتا ہے جو حق کو حق اور باطل کو باطل کے طور پر دیکھتا ہے؟ آیا ایسا شخص ان پاک دل افراد کی مانند ہوسکتا ہے جو ہر وقت محاسبۂ نفس میں مصروف رہتے ہیں تاکہ برے اعمال کے عادی بننے سے محفوظ رہ سکیں۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت کے ذیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا جا رہا ہے کہ ایسے لوگوں کی حالت پر غمگین نہ ہوں اور اپنی جان کو ہلاکت کے خطرے میں نہ ڈالیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے، اسے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے، اسے ہدایت دیتا ہے:

فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝

یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سزا ہے، ان لوگوں کے لیے جو بڑی جرأت مندی کے ساتھ گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیے۔

تفسیر فی ظلال میں ہے کہ جس شخص کی اچھی نیت اور اچھے اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دینے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے دل میں برے اعمال کے بارے میں ایک خاص قسم کی حساسیت پیدا کر دیتا ہے۔ ایسا شخص اپنے آپ کو اللہ کی سزا سے محفوظ نہیں سمجھتا۔ لہٰذا نقصان اور ہلاکت سے بچنے کے لیے ہر وقت محاسبۂ نفس میں مصروف رہتا ہے، ہمیشہ شیطان کی چالوں سے محتاط رہتا

ہے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امداد کا منتظر رہتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ہدایت اور گمراہی کے راستے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ (فی ظلال، ۶:۶۷۵)

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام (یا امام رضاؑ) کے اصحاب میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے امام سے سوال کیا کہ خود پسندی جو انسان کے عمل کو باطل کر دیتی ہے، وہ کیا ہے؟

آپؑ نے فرمایا:

العجب درجات منها ان یزین للعبد سوء عمله فیراه حسنا فیعجبه و یحسب انه یحسن صنعا

یعنی عجب اور خود پسندی کے مختلف درجات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اپنے برے کاموں کو اچھا سمجھنے لگے اور ان پر خوش ہونے لگے اور اس حیرت میں ڈوب جائے کہ اس نے کتنا عمدہ کام انجام دیا ہے۔

چوتھی آیت میں ملکہ سباء اور ان حالات کا ذکر ہے جن کی خبر ہدہد نے حضرت سلیمانؑ کو دی تھی۔ ہدہد نے اپنی اطلاع میں کہا کہ میں نے ملکہ اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ سورج کو سجدہ کرتے ہیں اور غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نظر میں خوش نما بنا دیا ہے:

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ سورج اور اس کی روشنی بہت باعظمت ہیں اور زندگی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہیں لیکن اس کا طلوع وغروب، بادل کے چھوٹے سے ٹکڑے کے پیچھے اس کا پوشیدہ ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنی تمام تر عظمت کے باوجود طبیعی قوانین کا پابند ہے اور خود اس کی ذات میں کسی قسم کا کوئی ارادہ نہیں پایا جاتا۔ یہی دلیل اس بات کے لیے کافی ہے کہ وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ لیکن آباؤ اجداد کی غلط تعلیم وتربیت اور تکرارِ عمل کے نتیجہ میں اس عمل کا قبح (برائی) ان کی نظر سے اوجھل ہو گیا تھا اور یہ عمل انہیں ایک اچھے عمل کی صورت میں نظر آتا تھا۔

دنیا کے بعض ممالک میں گائیں پائی جاتی ہیں جن کی لوگ پرستش کرتے ہیں۔ وہ ان کے سامنے ایسے اعمال انجام دیتے ہیں اور ان کے لیے ایسے مقام ومرتبہ کے قائل ہیں جنہیں دیکھ کر ہر خالی الذہن انسان ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا جبکہ ان کے پجاری بڑی سنجیدگی سے ان کی پوجا میں مصروف ہوتے ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ایک ہی عمل پر دوسرے ہنستے ہیں اور وہ اسی پر فخر کرتے ہیں، کیوں؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بار بار اس عمل کو انجام دینے کی وجہ سے اس عمل کا قبح اور اس کی برائی کا تصور ان کے ہاں سے رخصت ہو گیا۔

یہ بات صحیح ہے کہ اس آیت میں تزئین عمل کو شیطان کی طرف نسبت دی گئی ہے لیکن ظاہری بات ہے کہ شیطان کے بھی کچھ وسائل و ذرائع ہیں جن میں سے ایک برے اعمال کا بار بار انجام دینا اور ان کا عادی بن جانا ہے۔

پانچویں آیت میں بھی یہی حقیقت اختلافِ الفاظ کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ اس آیت میں خطاب رسولؐ اللہ سے ہے۔ آپؐ سے کہا جارہا ہے:

''لوگوں سے کہئے کہ آیا تمہیں ان لوگوں کے بارے میں باخبر کردوں جو سب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری کوشش دنیوی زندگی میں بھٹک کر رہ گئی مگر ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی جگہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ اچھے اعمال انجام دے رہے ہیں۔''

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾

اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو سب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔ جنہوں نے اپنی عمر کا قیمتی ترین سرمایہ یعنی جوانی اور فکر و عمل کی طاقتیں غلط راستوں میں صرف کر کے برباد کردیں اور سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اچھے کام کیے ہیں اور ان پر خوش ہوتے اور فخر کرتے ہیں۔

یہ لوگ اس بدبختی میں کیوں گرفتار ہوتے ہیں؟ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ برائی، بدکاری، ہوس پرستی اور خود پسندی کے نتیجہ میں ان کے عقل پر سیاہ پردہ پڑ گیا ہے جس کی وجہ سے وہ حقائق کو دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں اور حقائق ان کو اس طرح دکھائی ہی نہیں دیتے جس طرح حقیقت میں وہ ہوتے ہیں۔

اس بدبختی کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو اگلی آیت میں بیان ہو رہا ہے:

''یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کر چکے ہیں اور ان کے اعمال تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔''

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ

اس آیت کی تفسیر میں جو احادیث بیان ہوئی ہیں، ان میں ایسی عبارات نظر آتی ہیں جو اس آیت کے مصادیق میں سے کسی واضح مصداق کی نشاندہی کرتی ہیں اور یہ سب کے سب اس آیت کے اندر جمع ہیں۔ بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد منکرین ولایت علیؑ ہیں۔ بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ ان سے مراد مسیحی راہب ہیں جنہوں نے دنیا اور دنیوی لذتوں کو ترک کر دیا ہے، حالانکہ ایسا کر کے وہ گمراہ ہوئے ہیں۔

بعض احادیث میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد مسلمانوں میں سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین میں بدعتیں ایجاد کیں۔ بعض